ماہنامہ

موازنۂ مذاہب

ISSN: 20491131

ایڈیٹر: محفوظ الرحمان

مئی 2025ء | ہجرت 1404 ہجری شمسی | ذوالحجہ 1446 ہجری قمری | جلد 14 نمبر 05

اس شمارہ میں

https://www.alislam.org/periodical/muwazna-e-madhahib

(وحی اللہ)

دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اُسکو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اُسکی سچائی ظاہر کر دے گا۔

یہ رسالہ جسکا
نام
ہے

الوصیّۃ

کلام پاک
حضرت حجۃ اللہ مسیح موعود و مہدی معہود میرزا
غلام احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام
قادیانی

باہتمام چودھری اللہ داد میگزین پریس میں حضرت اقدس کی فرمائش سے

۲۴ - دسمبر ۱۹۰۵ء کو طبع ہوا۔

رسالہ ''الوصیّۃ'' ایڈیشن اوّل کا عکس۔
تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں رسالہ کا صفحہ 13

ماہنامہ موازنۂ مذاہب

جلد14 شمارہ 05 ھجرت 1404ھجری شمسی، ذوالقعدۃ 1446 ھجری قمری بمطابق مئی 2025ء

فہرست مضامین

پبلشرز : Additional Wakalat Tasneef

Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, GU9 9PS UK
office@tasneef.co.uk

اداریہ:

حقیقی عید کیا ہوتی ہے؟

مدیر کے قلم سے

حقیقی عید وہ احساس اور سوچ ہے کہ عید ہمارے لئے کیا پیغام اور کیا سبق لے کر آئی ہے اور وہ پیغام اور سبق یہ ہے کہ جن نیکیوں پر ہم اس رمضان میں قائم رہنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو ہم نے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگیوں کا حصّہ بنالینا ہے تاکہ ہم اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اس سے فیض اٹھانے والی ہوں۔

حقیقی عید اس بات کو دہرانے کا دن ہے کہ ہم نے جو کام اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑے تھے آج اللہ تعالیٰ کی اجازت سے وہ جائز کام ہم دوبارہ کر رہے ہیں اور اب ہم ان کو اپنی زندگیوں کا حصہ بناتے رہیں گے اور ہم حقوق اللہ بھی ادا کریں گے اور حقوق العباد بھی ادا کریں گے۔

یہ بات بھی ہمیں ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کریں اور کامل اطاعت کے اعلیٰ نمونے دکھائیں۔ تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور برکتوں کو حاصل کر سکیں اور ہمیں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی کی نعمتیں عطا ہوتی رہیں۔

پس عید کے موقع پر ہم نے یہ بھی عہد کرنا ہے کہ ہمارے قدم جو رمضان میں نیکیوں کی طرف بڑھے تھے اب وہ بڑھتے چلے جائیں گے۔ اگر یہ نہیں تو ہماری عید کی خوشیاں جو ہیں یہ سطحی اور عارضی ہوں گی جن کا ہماری زندگیوں پر اور ہماری روحانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

ایک احمدی جس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مانا ہے وہ خدا تعالیٰ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ تمام برائیوں سے توبہ کرتا ہے اور نیکیوں کی طرف توجہ کرے گا، اپنی زندگی کو پاک صاف بنائے گا۔ پس اس بات کو ہمیں عید کے دن ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نے جو عہد کئے ہیں ان کو پورا کرنا بھی ہمارا بڑا فرض ہے۔ اور ہمیں اب بڑی فکر سے اس عہد پر قائم رہنے کے لئے حتی الوسعی کوشش کرنی چاہیئے۔

پس عید کا دن ایک ایسا خاص دن ہے جس دن ہم پر چھ نمازیں فرض ہو جاتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے دن عبادت کی ادائیگی کے فرائض بھی ہم پر بڑھ گئے ہیں۔ اور ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے اگر ہم نے خدا تعالیٰ کو پانے کی کوشش نہیں کی تو پھر خوشیاں منانا کوئی بڑی بات نہیں۔

پس رمضان میں ہم میں سے جن لوگوں نے ایسی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کو حاصل کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ پھر انہیں وہ فیض پہنچاتا رہے گا جن کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ عید کے دن کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ

"یہ دن بے شک... مبارک اور خوشی کا دن ہے لیکن ایک دن ... سب سے بھی بڑھ کر مبارک اور خوشی کا دن ہے ... وہ دن کونسا دن ہے جو جمعہ اور عیدین سے بھی بہتر اور مبارک دن ہے؟ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ دن انسان کی توبہ کا دن ہے۔" (ملفوظات جلد 7 صفحہ 148 ایڈیشن 1984ء)

پس اس سوچ کے ساتھ ہمیں عید منانی چاہیئے کہ اس رمضان میں بہت سی برائیوں سے بچتے ہوئے اور نیکیاں اختیار کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی طرف خالص ہو کر جھکے ہیں یہی اصل عید ہے کہ ہم نے اللہ کی پناہ میں آنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہی ہماری سوچیں ہوں گی اور یہ ہمارے ماحول میں بھی پیدا ہو جائیں گی تبھی ہم حقیقی عید منا رہے ہوں گے۔

پس اگر یہ چیزیں ہم میں پیدا ہو جائیں تو سمجھیں کہ ہم نے مقصد کو پا لیا جس مقصد کے لئے ہم یہ عید منا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اندر پاک تبدیلیاں پیدا کرتا جائے اور کبھی وہ وقت نہ آئے جب ہم رمضان سے حاصل کی ہوئی پاک تبدیلیوں کو ضائع کرنے والے ہوں۔

ان سب باتوں کی طرف تفصیل کے ساتھ ہمارے پیارے امام حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اپنے خطبہ عید الفطر بیان فرمودہ 31 مارچ 2025ء میں توجہ دلائی ہے۔ خطبہ ثانیہ کے اختتام پر ہمارے پیارے امام حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے دعا کرائی اور **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ** فرما کر تمام احباب جماعت احمدیہ ہائے عالمگیر کو **عید مبارک** کا تحفہ عنایت فرمایا۔

حضور انور کا یہ خطبہ مختلف زبانوں میں براہ راست نشر ہوا، نیز جماعت احمدیہ کی مرکزی ویب سائٹ www.alislam.org پر احباب کے لئے موجود ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم گاہے بگاہے حضور انور کے خطبات اور خطابات کو پڑھتے رہا کریں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہا کریں۔

ارشاد باری تعالیٰ

خدائے تعالیٰ خلافت حقہ کو قائم کر کے مسلمانوں کو امن کی حالت میں کر دے گا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ** فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَ **لَيُمَكِّنَنَّ** لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ **خَوْفِهِمْ** اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (سورۃ النور: 56)

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام "براہین احمدیہ" میں فرماتے ہیں:

"خدا نے تم میں سے بعض نیکوکار ایمانداروں کے لئے یہ وعدہ ٹھہرا رکھا ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنے رسول مقبول کے خلیفے کرے گا انہیں کی مانند جو پہلے کرتا رہا ہے اور انکے دین کو کہ جو ان کیلئے اس نے پسند کرلیا ہے یعنی دین اسلام کو زمین پر جما دے گا اور مستحکم اور قائم کر دے گا اور بعد اسکے کہ ایماندار خوف کی حالت میں ہوں گے یعنی بعد اس وقت کے کہ جب بباعث وفات حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ خوف دامنگیر ہو گا کہ شاید اب دین تباہ نہ ہو جائے۔ تو اس خوف اور اندیشہ کی حالت میں خدائے تعالیٰ خلافت حقہ کو قائم کر کے مسلمانوں کو اندیشہ ابتری دین سے بے غم اور امن کی حالت میں کر دے گا وہ خالصاً میری پرستش کریں گے اور مجھ سے کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔"

("براہین احمدیہ" روحانی خزائن جلد1 صفحہ260,259 حاشیہ)

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم

ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ

”عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَا شَآءَ اللهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ فَتَكُوْنُ مَا شَآءَ اللهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا فَيَكُوْنُ مَا شَآءَ اللهُ اَنْ يَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُوْنُ مَا شَآءَ اللهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، ثُمَّ سَكَتَ۔“

(مسند الامام احمد بن حنبل جلد 6 صفحہ 285 مسند النعمان بن بشیر حدیث 18596، عالم الکتب بیروت 1998ء)

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم میں نبوت قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر وہ اس کو اٹھالے گا جب چاہے گا اور خلافت عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ قائم ہو گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس نعمت کو بھی اٹھالے گا۔ پھر ایذا رساں بادشاہت قائم ہو گی اور تب تک رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ (جب یہ دور ختم ہو گا) تو اس سے بھی بڑھ کر جابر بادشاہت قائم ہو گی اور تب تک رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا (پھر وہ ظلم ستم کے اس دور کو ختم کر دے گا جس کے بعد) پھر نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہو گی! یہ فرما کر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔

مُسْنَدُ الإمام أحمد بن حنبل

المتوفى ٢٤١ هـ

النعمان بن بشير ٢٨٥

١٨٥٩٦ ـ حدّثنا سليمان بن داود الطيالسي، حدَّثني داود بن إبراهيم الواسطي، حدَّثني حبيب بن سالم، عن النعمان بن بشير قال: كنا قعوداً في المسجد [١]، وكان بشير رجلاً يكف حديثه، فجاء أبو ثعلبة الخشني فقال: يا بشير بن سعد أتحفظ حديث رسول اللَّه ﷺ في الأمراء؟ فقال حذيفة: أنا أحفظ خطبته، فجلس أبو ثعلبة، فقال حذيفة: قال رسول اللَّه ﷺ: تكون النبوّة فيكم ما شاء اللَّه أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها ثم تكون خلافة على منهاج النبوّة فتكون ما شاء اللَّه أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء [٢] أن يرفعها ثم تكون ملكاً عاضاً فيكون ما شاء اللَّه أن يكون ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها ثم تكون ملكاً جبرية فتكون ما شاء اللَّه أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون خلافة على منهاج نبوّة [٣]، ثم سكت.

امام الکلام

خلیفہ در حقیقت رسول کا ظلّ ہوتا ہے

حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی بانیٔ جماعت احمدیہ مسیح موعود و مہدیٔ معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”بعض اور آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرور خداوند کریم نے یہی ارادہ فرمایا ہے کہ روحانی معلم جو انبیاء کے وارث ہیں ہمیشہ ہوتے رہیں اور وہ یہ ہیں:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔(النور: 56) **وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔**(الرعد: 32) **وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا** (بنی اسرائیل: 16)

یعنی خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے اے مومنان امت محمدیہ وعدہ کیا ہے کہ تمہیں بھی وہ زمین میں خلیفہ کرے گا جیسا کہ تم سے پہلوں کو کیا۔ اور ہمیشہ کفار پر کسی قسم کی کوفتیں جسمانی ہوں یا روحانی پڑتی رہیں گی یا ان کے گھر سے نزدیک آجائیں گی۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ آپہنچے گا۔ اور خدا تعالیٰ اپنے وعدوں میں تخلف نہیں کرتا۔ اور ہم کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ایک رسول بھیج نہ لیں۔

ان آیات کو اگر کوئی شخص تامل اور غور کی نظر سے دیکھے تو میں کیونکر کہوں کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ جائے کہ خدا تعالیٰ اس امت کے لئے خلافت دائمی کا صاف وعدہ فرماتا ہے اگر خلافت دائمی نہیں تھی تو شریعت موسوی کے خلیفوں سے تشبیہ دینا کیا معنی رکھتا تھا اور اگر خلافت راشدہ صرف تیس برس تک رہ کر پھر ہمیشہ کے لئے اس کا دور ختم

ہو گیا تھا تو اس سے لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہر گز یہ ارادہ نہ تھا کہ اس امت پر ہمیشہ کے لئے ابواب سعادت مفتوح رکھے کیونکہ روحانی سلسلہ کی موت سے دین کی موت لازم آتی ہے اور ایسا مذہب ہر گز زندہ نہیں کہلا سکتا جس کے قبول کرنے والے خود اپنی زبان سے ہی یہ اقرار کریں کہ تیرہ 1300 سو برس سے یہ مذہب مرا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس مذہب کے لئے ہر گز یہ ارادہ نہیں کیا کہ حقیقی زندگی کا وہ نور جو نبی کریمؐ کے سینہ میں تھا وہ توارث کے طور پر دوسروں میں چلا آوے۔

افسوس کہ ایسے خیال پر جمنے والے خلیفہ کے لفظ کو بھی جو استخلاف سے مفہوم ہوتا ہے تدبّر سے نہیں سوچتے کیونکہ خلیفہ جانشین کو کہتے ہیں اور رسول کا جانشین حقیقی معنوں کے لحاظ سے وہی ہو سکتا ہے جو ظلی طور پر رسول کے کمالات اپنے اندر رکھتا ہو اس واسطے رسول کریمؐ نے نہ چاہا کہ ظالم بادشاہوں پر خلیفہ کا لفظ اطلاق ہو کیونکہ **خلیفہ درحقیقت رسول کا ظلّ ہوتا ہے** اور چونکہ کسی انسان کے لئے دائمی طور پر بقا نہیں لہٰذا خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ رسولوں کے وجود کو جو تمام دنیا کے وجودوں سے اشرف و اولیٰ ہیں ظلی طور پر ہمیشہ کیلئے تا قیامت قائم رکھے۔ **سو اسی غرض سے خدا تعالیٰ نے خلافت کو تجویز کیا تا دنیا کبھی اور کسی زمانہ میں برکات رسالت سے محروم نہ رہے۔**

پس جو شخص خلافت کو صرف تیس برس تک مانتا ہے وہ اپنی نادانی سے خلافت کی علت غائی کو نظر انداز کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کا یہ ارادہ تو ہر گز نہیں تھا کہ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک رسالت کی برکتوں کو خلیفوں کے لباس میں قائم رکھنا ضروری ہے پھر بعد اس کے دنیا تباہ ہو جائے تو ہو جائے کچھ پرواہ نہیں . . .

پس یہ حقیر خیال خدا تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنا کہ اس کو صرف اس امت کے تیس 30 برس کا ہی فکر تھا اور پھر ان کو ہمیشہ کے لئے ضلالت میں چھوڑ دیا اور وہ نور جو قدیم سے انبیاء سابقین کی امت میں خلافت کے آئینہ میں وہ دکھلاتا رہا اس امت کے لیے دکھلانا اس کو منظور نہ ہوا۔ کیا عقل سلیم خدائے رحیم و کریم کی نسبت ان باتوں کو تجویز کرے گی۔ ہر گز نہیں۔ اور پھر یہ آیت خلافت ائمہ پر گواہ ناطق ہے وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِي الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّكۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوۡنَ (الانبیاء:106) کیونکہ یہ آیت صاف صاف پکار رہی ہے کہ اسلامی خلافت دائمی ہے اس لئے کہ

یَرِثُھَا کا لفظ دوام کو چاہتا ہے۔ وجہ یہ کہ اگر آخری نوبت فاسقوں کی ہو تو زمین کے وارث وہی قرار پائیں گے نہ کہ صالح اور سب کا وارث وہی ہوتا ہے جو سب کے بعد ہو۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ جس حالت میں خدا تعالیٰ نے ایک مثال کے طور پر سمجھا دیا تھا کہ میں اسی طور پر اس امت میں خلیفے پیدا کرتا رہوں گا جیسے موسیٰ کے بعد خلیفے پیدا کئے تو دیکھنا چاہیئے تھا کہ موسیٰ کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا۔ کیا اس نے صرف تیس برس تک خلیفے بھیجے یا چودہ سو برس تک اس سلسلہ کو لمبا کیا۔ پھر جس حالت میں خدا تعالیٰ کا فضل ہمارے نبی ﷺ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہیں زیادہ تھا چنانچہ اس نے خود فرمایا: وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء: 114) اور ایسا ہی اس امت کی نسبت فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (ال عمران: 111) تو پھر کیونکر ہوسکتا تھا کہ حضرت موسیٰ کے خلیفوں کا چودہ سو برس تک سلسلہ ممتد ہو اور اس جگہ صرف تیس برس تک خلافت کا خاتمہ ہو جاوے اور نیز جب کہ یہ امت خلافت کے انوار روحانی سے ہمیشہ کے لئے خالی ہے تو پھر آیت اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے کیا معنی ہیں کوئی بیان تو کرے۔ مثل مشہور ہے کہ اُو خویشتن گم است کرا ر اہبری کند۔ جب کہ اس امت کو ہمیشہ کے لئے اندھا رکھنا ہی منظور ہے اور اس مذہب کو مردہ رکھنا ہی مدّ نظر ہے تو پھر یہ کہنا کہ تم سب سے بہتر ہو اور لوگوں کی بھلائی اور رہنمائی کے لئے پیدا کئے گئے ہو کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا ہے سو اے لوگو جو مسلمان کہلاتے ہو برائے خدا سوچو کہ اس آیت کے یہی معنی ہیں کہ ہمیشہ قیامت تک تم میں روحانی زندگی اور باطنی بینائی رہے گی۔ اور غیر مذہب والے تم سے روشنی حاصل کریں گے اور یہ روحانی زندگی اور باطنی بینائی جو غیر مذہب والوں کو حق کی دعوت کرنے کے لئے اپنے اندر لیاقت رکھتی ہے یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے لفظوں میں خلافت کہتے ہیں پھر کیونکر کہتے ہو کہ خلافت صرف تیس برس تک ہو کر پھر زاویہ عدم میں مخفی ہو گئی۔ اِتَّقُوا اللّٰہ۔ اِتَّقُوا اللّٰہ۔ اِتَّقُوا اللّٰہ۔"

("شہادۃ القرآن" روحانی خزائن جلد 06 صفحہ 352 تا 355)

کلام الامام

مسیح موعودؑ کے ذریعہ خلافت علی منہاج نبوت

امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں:

''ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ اسلام کی تاریخ میں مختلف ادوار میں آنے والے مسلمان سربراہان حکومت اپنے آپ کو خلفاء کہلاتے رہے۔ یہ بتاتے رہے کہ ان کا مقام خلیفہ کا مقام ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جو پہلے چار خلفاء ہیں ان کو ہی خلفائے راشدین کا مقام دیتی ہے۔ انہی کا دور خلافت راشدہ کا دَور کہلاتا ہے۔ یعنی وہ دَور جو ہدایت یافتہ اور ہدایت پھیلانے والا دَور تھا جو اپنے نظام کو اس طرح چلاتے رہے جس طرح انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چلاتے دیکھا۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق اس نظام کو چلایا۔ خاندانی بادشاہت نہیں رہی بلکہ مومنین کی جماعت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے خلافت کی رداء انہیں پہنائی۔ لیکن ان کے علاوہ باقی خلفاء خاندانی بادشاہت کو ہی قائم رکھتے رہے اور حرف بہ حرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ جب پہلی دو باتوں میں یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی تو جو آخری بات آپؐ نے بیان فرمائی اس میں بھی ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول نے ہی پورا ہونا تھا کہ اس دنیاداری اور مسلمانوں کے بگڑے ہوئے حالات کو دیکھ کر وہ خدا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تاقیامت قائم رہنے والی شریعت کے ساتھ بھیجا تھا اس کا رحم جوش مارتا اور خلافت علی منہاج نبوت کو دنیا میں دوبارہ قائم فرماتا۔

اور ہم احمدی یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے گئے وعدے کے مطابق اپنے رحم کو جوش دلایا۔ اس کا رحم جوش میں آیا اور ہمارے آقا و مولیٰ کی بات کو پورا فرماتے ہوئے مسیح موعود اور مہدی معہود کے ذریعہ خلافت علی منہاج نبوت کو قائم فرمایا۔ آپ کو جہاں امّتی نبی ہونے کا مقام عطا فرمایا وہاں خاتم الخلفاء کے مقام سے بھی نوازا کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ خلافت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام صادق اور خاتم الخلفاء کے ذریعہ سے ہی جاری ہونا ہے۔

پس ہم خوش قسمت ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خوشخبری سے حصہ پانے والوں میں شامل ہیں جو آپ نے خلافت علی منہاج نبوت کے قیام کی ہمیں عطا فرمائی تھی۔"

(از خطبہ جمعہ بیان فرمودہ 29 مئی 2015ء، خطبات مسرور جلد 13 صفحہ 330,329)

حضور ایدہٗ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا احسان ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد ایک جھٹکا تو جماعت کو لگا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے ذریعہ جماعت کو فوراً سنبھال لیا۔ اگر کسی کی کوئی نیت شرارت کی تھی بھی تو وہ جلد ہی قابو میں آ گئے۔ پھر حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے وصال کے بعد جماعت کو ایک بڑا جھٹکا لگا اور جماعت کے بعض سرکردہ، جماعت مبائعین سے علیحدہ بھی ہو گئے، خلافت کے انکاری بھی ہو گئے اور کافی سخت حالات تھے۔ ایک لمبی تفصیل ہے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ آخر میں خلافت ہی کامیاب ہوئی اور کامیابیوں کی راہوں پر چلتی چلی گئی اور منزلیں طے کرتی چلی گئی۔ پھر خلافت ثالثہ میں ... سختیوں کے دَور آئے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا۔ حکومت کے خوفناک منصوبے تھے لیکن جماعت کی ترقی میں کوئی روک نہیں پیدا ہو سکی۔ خلافت رابعہ میں مزید سختی پاکستان کی حکومت نے دکھائی تو اس ابتلا میں بھی اللہ تعالیٰ نے تسکین کے سامان پیدا فرما دیئے۔ جماعت نئی منزلیں طے کرنے لگی۔ تبلیغ کے نئے نئے راستے کھلنے لگے اور پھر سیٹلائٹ کے ذریعہ سے دنیا میں تبلیغ جانے لگی۔ پھر خلافت خامسہ میں بھی نئے راستوں میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔

جماعت کا پیغام ہزاروں سے نکل کر، بلکہ لاکھوں سے نکل کر کروڑوں میں جانے لگ گیا۔ ایک ملک یا دو ملکوں کی بجائے کئی ملکوں میں اب مخالفت شروع ہو گئی ہے اور یہی احمدیت کی سچائی کی دلیل ہے اور یہی ترقی کی نشانی بھی ہے۔ احمدیت سے پیچھے ہٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے موافق ترقی کی راہیں کھولتا چلا جا رہا ہے اور

ترقی ہوتی چلی جا رہی ہے اور یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ عارضی روکوں کے باوجود اسلام کا غلبہ انشاء اللہ تعالیٰ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ اور آپ کے بعد جاری نظام خلافت کے ذریعہ ہی ہونا ہے۔ مخالفین چاہیں جتنا مرضی زور لگا لیں ان کے حصہ میں نامرادی اور ناکامی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو توفیق دے کہ وہ اپنے ایمان میں بھی مضبوط ہو اور اعمال صالحہ بجالانے والا بھی ہو اور عبادتوں کے معیار بھی ہر احمدی کے بلند ہوتے چلے جائیں تا کہ ہم ہمیشہ اس ترقی کا حصہ بننے والے رہیں۔"

(از خطبہ جمعہ بیان فرمودہ 26 مئی 2017ء، خطبات مسرور جلد 15 صفحہ 247)

حضور ایدہٗ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں:

"**27 مئی... جیسا کہ ہر احمدی جانتا ہے اس دن جماعت احمدیہ میں** حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد خلافت کا آغاز ہوا اور اس کی مناسبت سے جماعت میں یہ دن یوم خلافت کے طور پر منایا جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے وعدے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قدرت ثانیہ کے متعلق دی ہوئی خوشخبری پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بکھرنے سے بچا لیا۔ ہمیں ایک لڑی میں پرو دیا۔ اور اس حوالے سے ہم یہ عہد بھی کرتے ہیں کہ ہم خلافت احمدیہ کے قیام اور ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے بھی تیار رہیں گے۔ (انشاء اللہ)"

(از خطبہ جمعہ بیان فرمودہ 27 مئی 2016ء، خطبات مسرور جلد 14 صفحہ 286)

حضور ایدہٗ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ افراد جماعت کو... یہ توفیق دے کہ خلافت کی باتوں کو نہ صرف سننے والے ہوں بلکہ عمل کرنے والے بھی ہوں۔... یوم خلافت پر صرف وفا کا اظہار کر دینا یا وفا کا اظہار کر کے یوم خلافت کی مبارکباد دے کر اپنے آپ کو فرض ادا کرنے والے نہ سمجھیں۔ اللہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق ہم خلافت کے انعام کو سنبھالنے والے ہوں۔"

(از خطبہ جمعہ بیان فرمودہ 29 مئی 2015ء، خطبات مسرور جلد 13 صفحہ 341)

تعارف کتاب "رسالہ الوصیّۃ"

وہ خزائن جو ہزاروں سال سے مدفون تھے

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

"سب دوستوں کے واسطے ضروری ہے کہ ہماری کتب کم از کم ایک دفعہ ضرور پڑھ لیا کریں، کیونکہ علم ایک طاقت ہے اور طاقت سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔"

("ملفوظات" حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جلد7 صفحہ224 ایڈیشن2022ء)

(اے۔ آر۔ حیدر)

تعارف:

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی وفات سے تقریباً اڑھائی برس پہلے **الوصیّۃ** نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اب روحانی خزائن جلد20 (صفحہ299 تا332) میں شامل ہے۔ اس چھوٹے سے رسالہ میں آپؑ نے احمدیت کے روشن اور تابناک مستقبل کا ایک خاکہ پیش فرمادیا۔ بلکہ بتادیا کہ سلسلہ احمدیہ کو اللہ کے فضل و کرم سے حیرت انگیز ترقیات نصیب ہوں گی۔ اور یہ سلسلہ دنیا بھر میں پھیل جائے گا لیکن یہ ساری ترقیات خلافت کے ساتھ وابستہ ہوں گی بعینہٖ اسی طرح جس طرح خلافت راشدہ میں اسلام کو ترقیات نصیب ہوئیں اور وہ تمام پیشگوئیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھیں لیکن ان کا ایک حصّہ آپ ﷺ کی مبارک زندگی میں پورا ہوا اور باقی تمام تر پیشگوئیاں اور فتوحات و ترقیات سب خلافت کے زمانہ میں پوری ہوئیں۔ بعینہٖ وہ تمام تر وعدے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس علیہ السلام سے فرمائے ان میں سے ہر وہ وعدہ جو ہمیں آپؑ کی زندگی میں پورا ہوتا ہوا اگر نظر نہیں آتا تو وہ یقیناً عہد خلافت میں ہم نے پورا ہوتے ہوئے دیکھا اور دیکھ رہے ہیں اور دیکھتے چلے جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز، فالحمدللہ علیٰ ذالك۔

اس رسالہ کے اہم مضامین پوائنٹ کی صورت، پیش خدمت ہیں:

(1) آپؑ نے کچھ عربی الہامات کا ذکر فرمایا جن میں یہ واضح اشارہ تھا کہ آپؑ کی وفات کا وقت قریب ہے۔اور عربی الہامات کے ساتھ اردو میں یہ الہامات تھے ”بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں اُس دن سب پر اُداسی چھا جائے گی۔ یہ ہو گا یہ ہو گا یہ ہو گا۔ بعد اِس کے تمہارا واقعہ ہو گا تمام حوادث اور عجائبات قدرت دکھلانے کے بعد تمہارا حادثہ آئے گا۔“

(2) انہیں الہامات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی وعدہ فرمایا کہ آج جو حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں ایک وقت آئے گا کہ یہ سب باتیں اور باتیں کرنے والے نیست و نابود ہو جائیں گے اور ان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

(3) اور اس کی تشریح کرتے ہوئے آپؑ نے فرمایا کہ:”اس جگہ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم تیری نسبت ایسے ذکر باقی نہیں چھوڑیں گے جو تیری رسوائی اور ہتک عزت کا موجب ہوں اس فقرہ کے دو معنے ہیں (1) اوّل یہ کہ ایسے اعتراضات کو جو رسوا کرنے کی نیت سے شائع کئے جاتے ہیں ہم دور کر دیں گے اور اُن اعتراضات کا نام و نشان نہ رہے گا۔(2) دوسرے یہ کہ ایسے شکایت کرنے والوں کو جو اپنی شرارتوں کو نہیں چھوڑتے اور بد ذکر سے باز نہیں آتے دُنیا سے اُٹھا لیں گے اور صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیں گے تب اُن کے نابود ہونے کی وجہ سے اُن کے بیہودہ اعتراض بھی نابود ہو جائیں گے۔“

(4) <u>سلسلہ احمدیہ کی تابناک ترقی اور خلافت کی بشارت</u> دیتے ہوئے فرمایا:”اور وہ اس سلسلہ کو پوری ترقی دے گا کچھ میرے ہاتھ سے اور کچھ میرے بعد۔ یہ خدا تعالیٰ کی سنت ہے اور جب سے کہ اُس نے انسان کو زمین میں پیدا کیا ہمیشہ اِس سنت کو وہ ظاہر کرتا رہا ہے کہ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں کی مدد کرتا ہے اور اُن کو غلبہ دیتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ۔(المجادلہ: 22)اور غلبہ سے مراد یہ ہے کہ جیسا کہ رسولوں اور نبیوں کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ خدا کی حجت زمین پر پوری ہو جائے اور اُس کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے اِسی طرح خدا تعالیٰ قوی نشانوں کے ساتھ اُن کی سچائی ظاہر کر دیتا ہے اور جس راستبازی کو وہ دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں اُس کی تخم ریزی اُنہیں کے ہاتھ سے کر دیتا ہے لیکن اُس کی پوری تکمیل اُن کے ہاتھ سے نہیں کرتا بلکہ ایسے وقت میں اُن کو وفات دے کر جو بظاہر ایک ناکامی کا خوف اپنے ساتھ رکھتا ہے مخالفوں کو ہنسی اور ٹھٹھے اور طعن اور تشنیع کا موقع دے دیتا ہے اور جب وہ ہنسی ٹھٹھا کر چکتے ہیں تو پھر ایک دوسرا ہاتھ اپنی قدرت کا دکھاتا ہے اور ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن کے ذریعہ سے وہ مقاصد جو کسی قدر ناتمام رہ گئے تھے اپنے کمال کو پہنچتے ہیں غرض دو قسم کی قدرت ظاہر کرتا ہے (1) اوّل خود نبیوں کے ہاتھ سے اپنی قدرت کا ہاتھ دکھاتا ہے (2) دوسرے ایسے وقت میں جب نبی کی وفات کے بعد مشکلات کا سامنا پیدا ہو جاتا ہے اور دشمن زور میں آجاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ

اب کام بگڑ گیا اور یقین کر لیتے ہیں کہ اب یہ جماعت نابود ہو جائے گی اور خود جماعت کے لوگ بھی تردّد میں پڑ جاتے ہیں اور اُن کی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں اور کئی بد قسمت مرتد ہونے کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ دوسری مرتبہ اپنی زبردست قدرت ظاہر کرتا ہے اور گرتی ہوئی جماعت کو سنبھال لیتا ہے پس وہ جو اخیر تک صبر کرتا ہے خدا تعالیٰ کے اس معجزہ کو دیکھتا ہے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے وقت میں ہوا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت ایک بے وقت موت سمجھی گئی اور بہت سے بادیہ نشین نادان مرتد ہو گئے اور صحابہؓ بھی مارے غم کے دیوانہ کی طرح ہو گئے۔ تب خدا تعالیٰ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو کھڑا کر کے دوبارہ اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا اور اسلام کو نابود ہوتے ہوتے تھام لیا اور اُس وعدہ کو پورا کیا جو فرمایا تھا وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔(النور: 56) یعنی خوف کے بعد پھر ہم ان کے پیر جما دیں گے۔

ایسا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ہوا جب کہ حضرت موسیٰؑ مصر اور کنعان کی راہ میں پہلے اِس سے جو بنی اسرائیل کو وعدہ کے موافق منزل مقصود تک پہنچا دیں فوت ہو گئے اور بنی اسرائیل میں اُن کے مرنے سے ایک بڑا ماتم برپا ہوا جیسا کہ توریت میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل اس بیوقت موت کے صدمہ سے اور حضرت موسیٰؑ کی ناگہانی جدائی سے چالیس 40 دن تک روتے رہے۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ ہوا۔ اور صلیب کے واقعہ کے وقت تمام حواری تتر بتر ہو گئے اور ایک ان میں سے مرتد بھی ہو گیا۔ سو اے عزیزو! جب کہ قدیم سے سُنّت اللہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ دو 2 قدرتیں دکھلاتا ہے تا مخالفوں کی دو 2 جھوٹی خوشیوں کو پامال کر کے دکھلاوے سو اب ممکن نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی قدیم سنت کو ترک کر دیوے۔ اس لئے تم میری اس بات سے جو میں نے تمہارے پاس بیان کی غمگین مت ہو اور تمہارے دل پریشان نہ ہو جائیں کیونکہ تمہارے لئے دوسری قدرت کا بھی دیکھنا ضروری ہے اور اُس کا آنا تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ **وہ دائمی ہے جس کا سلسلہ قیامت تک منقطع نہیں ہو گا۔ اور وہ دوسری قدرت نہیں آسکتی جب تک میں نہ جاؤں۔ لیکن مَیں جب جاؤں گا تو پھر خدا اُس دوسری قدرت کو تمہارے لئے بھیج دے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔**

(5) ”میں خدا کی طرف سے ایک قدرت کے رنگ میں ظاہر ہوا اور میں خدا کی ایک مجسم قدرت ہوں اور میرے بعد بعض اور وجود ہوں گے جو دوسری قدرت کا مظہر ہوں گے سو تم خدا کی قدرت ثانی کے انتظار میں اکٹھے ہو کر دعا کرتے رہو۔“

(6) ”خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُن تمام روحوں کو جو زمین کی متفرق آبادیوں میں آباد ہیں کیا یورپ اور کیا ایشیاء اُن سب

کو جو نیک فطرت رکھتے ہیں توحید کی طرف کھینچے اور اپنے بندوں کو دین واحد پر جمع کرے یہی خدا تعالیٰ کا مقصد ہے جس کے لئے میں دنیا میں بھیجا گیا سو تم اس مقصد کی پیروی کرو مگر نرمی اور اخلاق اور دعاؤں پر زور دینے سے۔"

(7) اور چاہیئے کہ تم بھی ہمدردی اور اپنے نفسوں کے پاک کرنے سے روح القدس سے حصہ لو کہ بجز روح القدس کے حقیقی تقویٰ حاصل نہیں ہو سکتی اور نفسانی جذبات کو بکلّی چھوڑ کر خدا کی رضا کے لئے وہ راہ اختیار کرو جو اُس سے زیادہ کوئی راہ تنگ نہ ہو۔ دنیا کی لذتوں پر فریفتہ مت ہو کہ وہ خدا سے جدا کرتی ہیں اور خدا کے لئے تلخی کی زندگی اختیار کرو۔ درد جس سے خدا راضی ہو اُس لذت سے بہتر ہے جس سے خدا ناراض ہو جائے۔ اور وہ شکست جس سے خدا راضی ہو اُس فتح سے بہتر ہے جو موجب غضب الٰہی ہو۔ اُس محبت کو چھوڑ دو جو خدا کے غضب کے قریب کرے۔ اگر تم صاف دل ہو کر اُس کی طرف آ جاؤ تو ہر ایک راہ میں وہ تمہاری مدد کرے گا اور کوئی دشمن تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

خدا کی رضا کو تم کسی طرح پا ہی نہیں سکتے جب تک تم اپنی رضا چھوڑ کر اپنی لذات چھوڑ کر اپنی عزت چھوڑ کر اپنا مال چھوڑ کر اپنی جان چھوڑ کر اُس کی راہ میں وہ تلخی نہ اُٹھاؤ جو موت کا نظارہ تمہارے سامنے پیش کرتی ہے۔ لیکن اگر تم تلخی اُٹھا لو گے تو ایک پیارے بچے کی طرح خدا کی گود میں آ جاؤ گے اور تم اُن راستبازوں کے وارث کئے جاؤ گے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں اور ہر ایک نعمت کے دروازے تم پر کھولے جائیں گے۔ لیکن تھوڑے ہیں جو ایسے ہیں۔ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تقویٰ ایک ایسا درخت ہے جس کو دل میں لگانا چاہیئے۔ وہی پانی جس سے تقویٰ پرورش پاتی ہے تمام باغ کو سیراب کر دیتا ہے۔ تقویٰ ایک ایسی جڑھ ہے کہ اگر وہ نہیں تو سب کچھ ہیچ ہے اور اگر وہ باقی رہے تو سب کچھ باقی ہے۔"

(8) انسان کو اس فضولی سے کیا فائدہ جو زبان سے خدا طلبی کا دعویٰ کرتا ہے لیکن قدم صدق نہیں رکھتا۔ دیکھو میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ آدمی ہلاک شدہ ہے جو دین کے ساتھ کچھ دنیا کی ملونی رکھتا ہے اور اُس نفس سے جہنم بہت قریب ہے جس کے تمام ارادے خدا کے لئے نہیں ہیں بلکہ کچھ خدا کے لئے اور کچھ دنیا کے لئے۔ پس اگر تم دنیا کی ایک ذرّہ بھی ملونی اپنے اغراض میں رکھتے ہو تو تمہاری تمام عبادتیں عبث ہیں۔ اس صورت میں تم خدا کی پیروی نہیں کرتے بلکہ شیطان کی پیروی کرتے ہو۔ تم ہرگز توقع نہ کرو کہ ایسی حالت میں خدا تمہاری مدد کرے گا۔ بلکہ تم اس حالت میں زمین کے کیڑے ہو اور تھوڑے ہی دنوں تک تم اس طرح ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح کہ کیڑے ہلاک ہوتے ہیں اور تم میں خدا نہیں ہو گا..... بلکہ تمہیں ہلاک کر کے خدا خوش ہو گا۔

لیکن اگر تم اپنے نفس سے در حقیقت مر جاؤ گے تب تم خدا میں ظاہر ہو جاؤ گے اور خدا تمہارے ساتھ ہو گا اور وہ گھر بابرکت ہو گا جس میں تم رہتے ہو گے اور اُن دیواروں پر خدا کی رحمت نازل ہو گی جو تمہارے گھر کی دیواریں ہیں۔ اور وہ

شہر بابرکت ہو گا جہاں ایسا آدمی رہتا ہو گا۔ اگر تمہاری زندگی اور تمہاری موت اور تمہاری ہر ایک حرکت اور تمہاری نرمی اور گرمی محض خدا کے لئے ہو جائے گی اور ہر ایک تلخی اور مصیبت کے وقت تم خدا کا امتحان نہیں کروگے اور تعلق کو نہیں توڑوگے بلکہ آگے قدم بڑھاؤ گے تو میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تم خدا کی ایک خاص قوم ہو جاؤ گے۔

تم بھی انسان ہو جیسا کہ میں انسان ہوں اور وہی میرا خدا تمہارا خدا ہے۔ پس اپنی پاک قوتوں کو ضائع مت کرو۔ اگر تم پورے طور پر خدا کی طرف جھکو گے تو دیکھو میں خدا کی منشاء کے موافق تمہیں کہتا ہوں کہ تم خدا کی ایک قوم برگزیدہ ہو جاؤ گے خدا کی عظمت اپنے دلوں میں بٹھاؤ اور اُس کی توحید کا اقرار نہ صرف زبان سے بلکہ عملی طور پر کرو تا خدا بھی عملی طور پر اپنا لطف و احسان تم پر ظاہر کرے۔ کینہ وری سے پرہیز کرو اور بنی نوع سے سچی ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ۔ ہر ایک راہ نیکی کی اختیار کرو نہ معلوم کس راہ سے تم قبول کئے جاؤ۔"

(9)　"تمہیں خوشخبری ہو کہ قرب پانے کا میدان خالی ہے۔ ہر ایک قوم دنیا سے پیار کر رہی ہے اور وہ بات جس سے خدا راضی ہو اُس کی طرف دنیا کو توجہ نہیں وہ لوگ جو پورے زور سے اس دروازہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں اُن کے لئے موقع ہے کہ اپنے جوہر دکھلائیں اور خدا سے خاص انعام پاویں یہ مت خیال کرو کہ خدا تمہیں ضائع کر دے گا تم خدا کے ہاتھ کا ایک بیج ہو جو زمین میں بویا گیا خدا فرماتا ہے کہ یہ بیج بڑھے گا اور پھولے گا اور ہر ایک طرف سے اس کی شاخیں نکلیں گی اور ایک بڑا درخت ہو جائے گا پس مبارک وہ جو خدا کی بات پر ایمان رکھے اور درمیان میں آنے والے ابتلاؤں سے نہ ڈرے کیونکہ ابتلاؤں کا آنا بھی ضروری ہے تا خدا تمہاری آزمائش کرے کہ کون اپنے دعویٰ بیعت میں صادق اور کون کاذب ہے۔ وہ جو کسی ابتلا سے لغزش کھائے گا وہ کچھ بھی خدا کا نقصان نہیں کرے گا اور بدبختی اُس کو جہنم تک پہنچائے گی اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو اُس کے لئے اچھا تھا۔

مگر وہ سب لوگ جو اخیر تک صبر کریں گے اور اُن پر مصائب کے زلزلے آئیں گے اور حوادث کی آندھیاں چلیں گی اور قومیں ہنسی اور ٹھٹھا کریں گی اور دنیا اُن سے سخت کراہت کے ساتھ پیش آئے گی وہ آخر فتح یاب ہوں گے اور برکتوں کے دروازے اُن پر کھولے جائیں گے۔ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں اپنی جماعت کو اطلاع دوں کہ جو لوگ ایمان لائے ایسا ایمان جو اُس کے ساتھ دنیا کی ملونی نہیں اور وہ ایمان نفاق یا بزدلی سے آلودہ نہیں اور وہ ایمان اطاعت کے کسی درجہ سے محروم نہیں ایسے لوگ خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں اور خدا فرماتا ہے کہ وہی ہیں جن کا قدم صدق کا قدم ہے۔"

(10)　اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کے متعلق فرمایا: "اے سننے والو سنو!! کہ خدا تم سے کیا چاہتا ہے بس یہی

کہ تم اُسی کے ہو جاؤ اُس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ ہمارا خدا وہ خدا ہے جو اب بھی زندہ ہے جیسا کہ پہلے زندہ تھا اور اب بھی وہ بولتا ہے جیسا کہ وہ پہلے بولتا تھا اور اب بھی وہ سنتا ہے جیسا کہ پہلے سنتا تھا۔ یہ خیال خام ہے کہ اس زمانہ میں وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ بلکہ وہ سنتا ہے اور بولتا بھی ہے، اس کی تمام صفات ازلی ابدی ہیں کوئی صفت بھی معطل نہیں اور نہ کبھی ہو گی۔ وہ وہی واحد لاشریک ہے جس کا کوئی بیٹا نہیں اور جس کی کوئی بیوی نہیں وہ وہی بے مثل ہے جس کا کوئی ثانی نہیں اور جس کی طرح کوئی فرد کسی خاص صفت سے مخصوص نہیں اور جس کا کوئی ہمتا نہیں جس کا کوئی ہم صفات نہیں اور جس کی کوئی طاقت کم نہیں وہ قریب ہے باوجود دور ہونے کے۔ اور دُور ہے باوجود نزدیک ہونے کے۔ وہ تمثّل کے طور پر اہل کشف پر اپنے تئیں ظاہر کر سکتا ہے مگر اُس کے لئے نہ کوئی جسم ہے اور نہ کوئی شکل ہے اور وہ سب سے اوپر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ اُس کے نیچے کوئی اور بھی ہے۔ اور وہ عرش پر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ زمین پر نہیں۔ وہ مجمع ہے تمام صفات کاملہ کا اور مظہر ہے تمام محامدِ حقہ کا اور سرچشمہ ہے تمام خوبیوں کا۔ اور جامع ہے تمام طاقتوں کا۔ اور مبدء ہے تمام فیضوں کا۔ اور مرجع ہے ہر ایک شَے کا۔ اور مالک ہے ہر ایک ملک کا۔ اور متصف ہے ہر ایک کمال سے۔ اور منزّہ ہے ہر ایک عیب اور ضعف سے۔ اور مخصوص ہے اِس امر میں کہ زمین والے اور آسمان والے اُسی کی عبادت کریں اور اُس کے آگے کوئی بات بھی اَنہونی نہیں اور تمام روح اور اُن کی طاقتیں اور تمام ذرّات اور اُن کی طاقتیں اُسی کی پیدائش ہیں۔ اُس کے بغیر کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی۔

وہ اپنی طاقتوں اور اپنی قدرتوں اور اپنے نشانوں سے اپنے تئیں آپ ظاہر کرتا ہے اور اُس کو اسی کے ذریعہ سے ہم پا سکتے ہیں اور وہ راستبازوں پر ہمیشہ اپنا وجود ظاہر کرتا ہے اور اپنی قدرتیں اُن کو دکھلاتا ہے اِسی سے وہ شناخت کیا جاتا اور اِسی سے اُس کی پسندیدہ راہ شناخت کی جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے بغیر جسمانی آنکھوں کے۔ اور سنتا ہے بغیر جسمانی کانوں کے۔ اور بولتا ہے بغیر جسمانی زبان کے۔ اسی طرح نیستی سے ہستی کرنا اُس کا کام ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ خواب کے نظارہ میں بغیر کسی مادہ کے ایک عالم پیدا کر دیتا ہے اور ہر ایک فانی اور معدوم کو موجود دکھلا دیتا ہے پس اسی طرح اس کی تمام قدرتیں ہیں۔ نادان ہے وہ جو اُس کی قدرتوں سے انکار کرے۔ اندھا ہے وہ جو اُس کی عمیق طاقتوں سے بے خبر ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے اور کر سکتا ہے بغیر اُن امور کے جو اُس کی شان کے مخالف ہیں یا اُس کے مواعید کے برخلاف ہیں۔ اور وہ واحد ہے اپنی ذات میں اور صفات میں اور افعال میں اور قدرتوں میں۔"

(11) فیضان مصطفیٰ ﷺ کے ہمیشہ جاری رہنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اور اُس تک پہنچنے کے لئے تمام دروازے بند ہیں مگر ایک دروازہ جو فرقان مجید نے کھولا ہے اور تمام نبوتیں اور تمام کتابیں جو پہلے گذر چکیں اُن کی الگ طور پر پیروی

کی حاجت نہیں رہی کیونکہ نبوت محمدیہؐ اُن سب پر مشتمل اور حاوی ہے۔ اور بجز اِس کے سب راہیں بند ہیں۔ تمام سچائیاں جو خدا تک پہنچاتی ہیں اسی کے اندر ہیں نہ اس کے بعد کوئی نئی سچائی آئے گی اور نہ اس سے پہلے کوئی ایسی سچائی تھی جو اس میں موجود نہیں اس لئے اِس نبوت پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہے اور ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس چیز کے لئے ایک آغاز ہے اس کے لئے ایک انجام بھی ہے لیکن یہ نبوت محمدیہؐ اپنی ذاتی فیض رسانی سے قاصر نہیں بلکہ سب نبوتوں سے زیادہ اِس میں فیض ہے اِس نبوت کی پیروی خدا تک بہت سہل طریق سے پہنچا دیتی ہے اور اس کی پیروی سے خدا تعالیٰ کی محبت اور اُس کے مکالمہ مخاطبہ کا اُس سے بڑھ کر انعام مل سکتا ہے جو پہلے ملتا تھا۔ مگر اِس کا کامل پیرو صرف نبی نہیں کہلا سکتا کیونکہ نبوت کاملہ تامہ محمدیہؐ کی اس میں ہتک ہے ہاں اُمّتی اور نبی دونوں لفظ اجتماعی حالت میں اُس پر صادق آ سکتے ہیں کیونکہ اس میں نبوت تامہ کاملہ محمدیہؐ کی ہتک نہیں بلکہ اُس نبوت کی چمک اِس فیضان سے زیادہ تر ظاہر ہوتی ہے (باوجود اس کے یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ نبوت تشریعی کا دروازہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل مسدود ہے اور قرآن مجید کے بعد اور کوئی کتاب نہیں جو نئے احکام سکھائے یا قرآن شریف کا حکم منسوخ کرے یا اس کی پیروی معطل کرے بلکہ اس کا عمل قیامت تک ہے۔ منہ)

اور جب کہ وہ مکالمہ مخاطبہ اپنی کیفیت اور کمیّت کی رو سے کمال درجہ تک پہنچ جائے اور اس میں کوئی کثافت اور کمی باقی نہ ہو۔ اور کھلے طور پر امور غیبیہ پر مشتمل ہو تو وہی دوسرے لفظوں میں نبوت کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ جس پر تمام نبیوں کا اتفاق ہے پس یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قوم جس کے لئے فرمایا گیا کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔(آل عمران: 111) اور جن کے لئے یہ دعا سکھائی گئی کہ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔(الفاتحہ: 7،6) اُن کے تمام افراد اس مرتبہ عالیہ سے محروم رہتے اور کوئی ایک فرد بھی اس مرتبہ کو نہ پاتا اور ایسی صورت میں صرف یہی خرابی نہیں تھی کہ اُمّت محمدیہؐ ناقص اور ناتمام رہتی اور سب کے سب اندھوں کی طرح رہتے بلکہ یہ بھی نقص تھا کہ آنحضرت ﷺ کی قوت فیضان پر داغ لگتا تھا اور آپ کی قوت قدسیہ ناقص ٹھہرتی تھی۔ اور ساتھ اس کے وہ دعا جس کا پانچ[5] وقت نماز میں پڑھنا تعلیم کیا گیا تھا اُس کا سکھلانا بھی عبث ٹھہرتا تھا۔ مگر اس کے دوسری طرف یہ خرابی بھی تھی کہ اگر یہ کمال کسی فرد اُمت کو براہ راست بغیر پیروی نور نبوت محمدیہ کے مل سکتا تو ختم نبوت کے معنے باطل ہوتے تھے پس ان دونوں خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے مکالمہ مخاطبہ کاملہ تامہ مطہرہ مقدسہ کا شرف ایسے بعض افراد کو عطا کیا جو فنافی الرسول کی حالت تک اتم درجہ تک پہنچ گئے اور کوئی حجاب درمیان نہ رہا اور اُمّتی ہونے کا مفہوم اور پیروی کے معنے اتم اور اکمل درجہ پر ان میں پائے گئے ایسے طور پر کہ اُن کا وجود اپنا وجود نہ رہا۔ بلکہ اُن کے محویت کے آئینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود منعکس ہو گیا اور دوسری طرف اتم اور اکمل طور پر مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ نبیوں کی طرح اُن کو نصیب ہوا۔

پس اس طرح پر بعض افراد نے باوجود اُمتی ہونے کے نبی ہونے کا خطاب پایا کیونکہ ایسی صورت کی نبوت نبوت محمدیہ سے الگ نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھو تو خود وہ نبوت محمدؐیہ ہی ہے جو ایک پیرایۂ جدید میں جلوہ گر ہوئی۔ یہی معنے اس فقرہ کے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے **مسیح موعود** کے حق میں فرمایا کہ نَبِیُّ اللّٰہِ ۔وَاِمَامُکُمْ مِنْکُمْ یعنی وہ نبی بھی ہے اور اُمّتی بھی ہے ورنہ غیر کو اس جگہ قدم رکھنے کی جگہ نہیں مبارک وہ جو اِس نکتہ کو سمجھے تا ہلاک ہونے سے بچ جائے۔"

(12) بہشتی مقبرہ کی بنیاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اور مجھے ایک جگہ دکھلا دی گئی کہ یہ تیری قبر کی جگہ ہوگی۔ ایک فرشتہ میں نے دیکھا کہ وہ زمین کو ناپ رہا ہے تب ایک مقام پر اُس نے پہنچ کر مجھے کہا کہ یہ تیری قبر کی جگہ ہے۔ پھر ایک جگہ مجھے ایک قبر دکھلائی گئی کہ وہ چاندی سے زیادہ چمکتی تھی اور اُس کی تمام مٹی چاندی کی تھی۔ تب مجھے کہا گیا کہ یہ تیری قبر ہے۔ اور ایک جگہ مجھے دکھلائی گئی اور اُس کا نام بہشتی مقبرہ رکھا گیا اور ظاہر کیا گیا کہ وہ اُن برگزیدہ جماعت کے لوگوں کی قبریں ہیں جو بہشتی ہیں۔

تب سے ہمیشہ مجھے یہ فکر رہی کہ جماعت کے لئے ایک قطعہ زمین قبرستان کی غرض سے خریدا جائے۔ لیکن چونکہ موقعہ کی عمدہ زمینیں بہت قیمت سے ملتی تھیں اس لئے یہ غرض مدت دراز تک معرضِ التواء میں رہی۔ اب اخویم مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جب کہ میری وفات کی نسبت بھی متواتر وحی الٰہی ہوئی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ قبرستان کا جلدی انتظام کیا جائے اس لئے میں نے اپنی ملکیّت کی زمین جو ہمارے باغ کے قریب ہے جس کی قیمت ہزار روپیہ سے کم نہیں اس کام کیلئے تجویز کی۔"

(13) بہشتی مقبرہ اور اس میں دفن ہونے والوں کے لئے دعا کرتے ہوئے فرمایا: "اور میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس میں برکت دے اور اسی کو بہشتی مقبرہ بنادے اور یہ اس جماعت کے پاک دل لوگوں کی خواب گاہ ہو جنہوں نے درحقیقت دین کو دنیا پر مقدم کر لیا اور دنیا کی محبت چھوڑ دی اور خدا کے لئے ہوگئے اور پاک تبدیلی اپنے اندر پیدا کر لی اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی طرح وفاداری اور صدق کا نمونہ دکھلایا۔ اٰمِیْن یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

پھر میں دعا کرتا ہوں کہ اے میرے قادر خدا اس زمین کو میری جماعت میں سے اُن پاک دلوں کی قبریں بنا جو فی الواقع تیرے لئے ہو چکے اور دنیا کی اغراض کی ملونی اُن کے کاروبار میں نہیں۔ اٰمِیْن یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

پھر میں تیسری دفعہ دعا کرتا ہوں کہ اے میرے قادر کریم اے خدائے غفور و رحیم تو صرف اُن لوگوں کو اس جگہ قبروں کی جگہ دے جو تیرے اس فرستادہ پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور کوئی نفاق اور غرض نفسانی اور بدظنی اپنے اندر نہیں

رکھتے اور جیسا کہ حق ایمان اور اطاعت کا ہے بجالاتے ہیں اور تیرے لئے اور تیری راہ میں اپنے دلوں میں جان فدا کر چکے ہیں جن سے تو راضی ہے اور جن کو تو جانتا ہے کہ وہ بکلّی تیری محبت میں کھوئے گئے اور تیرے فرستادہ سے وفاداری اور پورے ادب اور انشراحی ایمان کے ساتھ محبت اور جانفشانی کا تعلق رکھتے ہیں۔ اٰمِیْن یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

(14) ”**اور چونکہ اس قبرستان کے لئے بڑی بھاری بشارتیں مجھے ملی ہیں** اور نہ صرف خدا نے یہ فرمایا کہ یہ مقبرہ بہشتی ہے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اُنْزِلَ فِیْھَا کُلُّ رَحْمَةٍ یعنی ہر ایک قسم کی رحمت اِس قبرستان میں اُتاری گئی ہے اور کسی قسم کی رحمت نہیں جو اس قبرستان والوں کو اُس سے حصہ نہیں۔ اس لئے خدا نے میرا دل اپنی وحی خفی سے اِس طرف مائل کیا کہ ایسے قبرستان کے لئے ایسے شرائط لگا دیئے جائیں کہ وہی لوگ اس میں داخل ہو سکیں جو اپنے صدق اور کامل راستبازی کی وجہ سے اُن شرائط کے پابند ہوں سو وہ تین[3] شرطیں ہیں۔ اور سب کو بجالانا ہوگا۔“

(15) **بہشتی مقبرہ کے لئے شرائط:** ”سو پہلی شرط یہ ہے کہ ہر ایک شخص جو اس قبرستان میں مدفون ہونا چاہتا ہے وہ اپنی حیثیت کے لحاظ سے اِن مصارف کے لئے چندہ داخل کرے۔ اور یہ چندہ محض اُنہیں لوگوں سے طلب کیا گیا ہے نہ دوسروں سے۔ **دوسری شرط یہ ہے** کہ تمام جماعت میں سے اِس قبرستان میں وہی مدفون ہوگا جو یہ وصیّت کرے جو اُس کی موت کے بعد دسواں حصہ اُس کے تمام ترکہ کا حسب ہدایت اس سلسلہ کے اشاعت اسلام اور تبلیغ احکام قرآن میں خرچ ہوگا۔ اور ہر ایک صادق کامل الایمان کو اختیار ہوگا کہ اپنی وصیّت میں اس سے بھی زیادہ لکھ دے۔ لیکن اس سے کم نہیں ہوگا۔ ..... **تیسری شرط یہ ہے** کہ اس قبرستان میں دفن ہونے والا متقی ہو اور محرمات سے پرہیز کرتا اور کوئی شرک اور بدعت کا کام نہ کرتا ہو سچا اور صاف مسلمان ہو۔“

(16) ”ہر ایک صالح جو اُس کی کوئی بھی جائداد نہیں اور کوئی مالی خدمت نہیں کر سکتا اگر یہ ثابت ہو کہ وہ دین کے لئے اپنی زندگی وقف رکھتا تھا اور صالح تھا تو وہ اس قبرستان میں دفن ہو سکتا ہے۔“

(17) ”یہ مت خیال کرو کہ یہ صرف دُور از قیاس باتیں ہیں۔ بلکہ یہ اُس قادر کا ارادہ ہے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے۔ مجھے اس بات کا غم نہیں کہ یہ اموال جمع کیونکر ہوں گے اور ایسی جماعت کیونکر پیدا ہوگی جو ایمانداری کے جوش سے یہ مردانہ کام دکھلائے بلکہ مجھے یہ فکر ہے کہ ہمارے زمانہ کے بعد وہ لوگ جن کے سپرد ایسے مال کئے جائیں وہ کثرت مال کو دیکھ کر ٹھوکر نہ کھاویں اور دنیا سے پیار نہ کریں۔ سو میں دعا کرتا ہوں کہ ایسے امین ہمیشہ اِس سلسلہ کو ہاتھ آتے رہیں جو خدا کے لئے کام کریں۔“

(18) **مومن اور منافق کا امتیاز:** فرمایا۔۔۔ ”میری نسبت اور میرے اہل و عیال کی نسبت خدا نے استثناء رکھا ہے۔ باقی ہر ایک مرد ہو یا عورت ہو اُن کو ان شرائط کی پابندی لازم ہو گی اور شکایت کرنے والا منافق ہو گا۔ یہ وہ شرائط ضرور یہ ہیں جو اوپر لکھی گئیں۔ آئندہ اس مقبرہ بہشتی میں وہ دفن کیا جائے گا جو ان شرائط کو پورا کرے گا۔ ممکن ہے کہ بعض آدمی جن پر بدگمانی کا مادہ غالب ہو وہ ہمیں اس کارروائی میں اعتراضوں کا نشانہ بناویں اور اس انتظام کو اغراض نفسانیہ پر مبنی سمجھیں یا اس کو بدعت قرار دیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے کام ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ بلاشبہ اس نے ارادہ کیا ہے کہ اس انتظام سے منافق اور مومن میں تمیز کرے اور ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ جو لوگ اس الٰہی انتظام پر اطلاع پا کر بلا توقف اس فکر میں پڑتے ہیں کہ دسواں 10 حصہ کل جائیداد کا خدا کی راہ میں دیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنا جوش دکھلاتے ہیں وہ اپنی ایمانداری پر مہر لگا دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ۔(العنکبوت: 2،3) کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ میں اسی قدر پر راضی ہو جاؤں کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے۔ اور ابھی ان کا امتحان نہ کیا جائے اور یہ امتحان تو کچھ بھی چیز نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا امتحان جانوں کے مطالبہ پر کیا گیا اور انہوں نے اپنے سر خدا کی راہ میں دیئے پر ایسا گمان کہ کیوں یوں ہی عام اجازت ہر ایک کو نہ دی جائے کہ وہ اس قبرستان میں دفن کیا جائے۔ کس قدر دُور از حقیقت ہے۔ اگر یہی روا ہو تو خدا تعالیٰ نے ہر ایک زمانہ میں امتحان کی کیوں بناڈالی؟ وہ ہر ایک زمانہ میں چاہتا رہا ہے کہ خبیث اور طیّب میں فرق کر کے دکھلاوے اِس لئے اُس نے اب بھی ایسا ہی کیا۔

خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض خفیف خفیف امتحان بھی رکھے ہوئے تھے جیسا کہ یہ بھی دستور تھا کہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کا مشورہ نہ لے جب تک پہلے نذرانہ داخل نہ کرے۔ پس اس میں بھی منافقوں کے لئے ابتلا تھا۔ ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت کے امتحان سے بھی اعلیٰ درجہ کے مخلص جنہوں نے در حقیقت دین کو دنیا پر مقدم کیا ہے دوسرے لوگوں سے ممتاز ہو جائیں گے۔ اور ثابت ہو جائے گا کہ بیعت کا اقرار انہوں نے سچا کر کے دکھلا دیا اور اپنا صدق ظاہر کر دیا۔ بے شک یہ انتظام منافقوں پر بہت گراں گذرے گا اور اس سے ان کی پردہ دری ہو گی۔ اور بعد موت وہ مرد ہوں یا عورت اس قبرستان میں ہرگز دفن نہیں ہو سکیں گے۔ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔(البقرۃ: 11) لیکن اس کام میں سبقت دکھلانے والے راستبازوں میں شمار کئے جائیں گے۔ اور ابد تک خدا کی اُن پر رحمتیں ہوں گی۔“

(19) ”بالآخر یہ بھی یاد رہے کہ بلاؤں کے دن نزدیک ہیں اور ایک سخت زلزلہ جو زمین کو تہ وبالا کر دے گا قریب ہے پس وہ جو معائنہ عذاب سے پہلے اپنا تارک الدنیا ہونا ثابت کر دیں گے اور نیز یہ بھی ثابت کریں گے کہ کس طرح انہوں نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ خدا کے نزدیک حقیقی مومن وہی ہیں اور اُس کے دفتر میں سابقین اوّلین لکھے جائیں گے۔

اور میں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ زمانہ قریب ہے کہ ایک منافق جس نے دنیا سے محبت کر کے اس حکم کو ٹال دیا ہے وہ عذاب کے وقت آہ مار کر کہے گا کہ کاش میں تمام جائیداد کیا منقولہ اور کیا غیر منقولہ خدا کی راہ میں دے دیتا اور اس عذاب سے بچ جاتا۔ یاد رکھو! کہ اس عذاب کے معائنہ کے بعد ایمان بے سُود ہو گا اور صدقہ خیرات محض عبث۔

دیکھو! میں بہت قریب عذاب کی تمہیں اطلاع دیتا ہوں اپنے لئے وہ زاد جلد تر جمع کرو کہ کام آوے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سے کوئی مال لوں اور اپنے قبضہ میں کر لوں بلکہ تم اشاعتِ دین کے لئے ایک انجمن کے حوالہ اپنا مال کرو گے اور بہشتی زندگی پاؤ گے۔ بہتیرے ایسے ہیں کہ وہ دنیا سے محبت کر کے میرے حکم کو ٹال دیں گے مگر بہت جلد دنیا سے جدا کئے جائیں گے تب آخری وقت میں کہیں گے: هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ۔ (یسین: 53)

(اور ایک دوسرے سے کہیں گے) یہ تو وہی بات ہے جس کا رحمٰن (خدا) نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے جو کچھ کہا تھا سچ ہی کہا تھا۔

درسِ توحید

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

وہ دیکھتا ہے غیروں سے کیوں دِل لگاتے ہو ۔۔۔ جو کچھ بتوں میں پاتے ہو اس میں وُہ کیا نہیں

واحد ہے لاشریک ہے اور لازوال ہے ۔۔۔ سب موت کا شکار ہیں اُس کو فنا نہیں

سب خیر ہے اسی میں کہ اس سے لگاؤ دل ۔۔۔ ڈھونڈو اسی کو یارو! بتوں میں وفا نہیں

(درثمین اردو صفحہ 152)

دکھ اور اَلَم کا مسئلہ

ایک دہریہ اور ایک مومن کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ کا جائزہ

از افاضات حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ

حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی انگریزی زبان میں معرکۃ الآراء اور عہد ساز تصنیف Revelation, Rationality, Knowledge and Truth میں The Question of Suffering کے تحت اس مسئلہ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ (الہام، عقل، علم اور سچائی) کے نام سے وکالت تصنیف ربوہ کی طرف سے شائع شدہ ہے۔ جس میں سے قارئین کے لئے اس مسئلہ کا حل پیش ہے۔ حضورؒ کی یہ تصنیف انگریزی زبان میں مندرجہ بالا لنک پر میسر ہے۔

https://www.alislam.org/book/revelation-rationality-knowledge-truth

حضورؒ کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ حضورؒ کے ارشاد کے مطابق جماعت احمدیہ کے مختلف اہل علم احباب وخواتین کے سپرد کیا گیا تھا جنہوں نے محنت اور اخلاص سے ترجمہ کیا۔ ان احباب کی تفصیل اردو ترجمہ والی کتاب کے آغاز میں موجود ہے۔

حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”حواس اور متعلقہ اعضاء کے ارتقائی مطالعہ سے بآسانی یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ان میں نفع نقصان کا احساس شروع ہی سے موجود تھا۔ یہ ارتقائی سفر فائدہ اور نقصان کی شناخت پر مبنی ایک طویل سفر ہے جس کے نتیجہ میں اعضائے حس بتدریج ترقی پا کر خوشی اور تکلیف، آرام اور دکھ کی موجودگی کو محسوس کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اگر ہم پیچھے مڑ کر حیات کی سب سے ادنیٰ حالت کا جائزہ لیں اور اس زینہ کے نچلے درجوں کا چوٹی کے اعلیٰ مراحل کے ساتھ مقابلہ کریں تو یہ جان لینا مشکل نہیں رہتا کہ دراصل ارتقا سے، احساس اور شعور کا ارتقا ہی مراد ہے۔ زندگی تسلسل کے ساتھ شعور کے دائرے میں نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کر رہی ہے جس کے نتیجہ میں احساس کی قوتیں مسلسل بیدار سے بیدار تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

آغاز حیات میں سود و زیاں کا احساس خاصا دھندلا اور مبہم ہوا کرتا ہے اور ابتدائی حیات کی جسمانی ساخت میں اس احساس کو کنٹرول کرنے والا کوئی مرکز دریافت نہیں ہوا لیکن اپنے ماحول اور بعض عناصر کی موجودگی میں ان کے ردّ عمل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مبہم سا شعور موجود ضرور ہے۔ یہی وہ بظاہر مبہم اور ناقابل بیان حس ہے جسے خالق نے کسی نہ کسی طرح قوت ادراک کی شروعات میں استعمال کیا ہے۔ اسی قوت مدرکہ نے بتدریج ترقی پا کر جانداروں کے جسم میں اپنی جگہ بنا لی۔ یہی مقامات بالآخر موجودہ اعضائے حِس کی شکل اختیار کر گئے۔ دماغ کی تخلیق ایک الگ اور غیر متعلق واقعہ نہیں۔ اعضائے حِس کی ترقی کسی بھی متوازی مرکزی اعصابی نظام کے بغیر با مقصد نہیں ہو سکتی جو مختلف اعضائے حِس کے ذریعہ پہنچائے جانے والے پیغامات کی تشریح کر سکے۔ چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ دماغ نے بھی اعضائے حِس کے لازمی جزو کے طور پر ساتھ ساتھ ترقی کی ہے۔ شعور جتنا زیادہ ترقی یافتہ ہو گا سود و زیاں کا احساس بھی اتنا ہی شدید ہو گا جسے مخصوص اعصابی مراکز محسوس کر کے نقصان کے احساس کو بطور رنج اور فائدہ کے احساس کو بطور راحت اعصاب کے ذریعہ ذہن تک منتقل کرتے ہیں۔

شعور جتنا کم ترقی یافتہ ہو گا اتنا ہی تکلیف کا احساس بھی کم ہو گا۔ یہی حال خوشی کا ہے۔ اس طرح خوشی اور غم کے احساس کیلئے اعضائے حِس کی موجودگی ناگزیر ہے۔ امکان غالب ہے کہ اگر تکلیف محسوس کرنے کی صلاحیت کو کم کر دیا جائے تو اس کے ساتھ ساتھ خوشی اور لذت محسوس کرنے کی صلاحیت بھی اسی حد تک کم ہو جائے گی۔ یہ دونوں برابر اہمیت کے حامل ہیں اور یکساں طور پر ارتقا کے پہیہ کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ورنہ ارتقا کا تمام تخلیقی منصوبہ کالعدم ہو جائے گا۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکلیف کو اپنی حیثیت میں ایک علیحدہ وجود کے طور پر نہیں بلکہ

لذت اور آرام کے ایک ناگزیر جزو کے طور پر پیدا کیا ہے۔ خوشی کی عدم موجودگی تکلیف ہے جو کہ اس کے سائے کی طرح ہے بالکل اسی طرح جیسے تاریکی ایک سایہ ہے جو روشنی کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہے۔ زندگی کیلئے موت ناگزیر ہے۔ دونوں مختلف درجات پر مشتمل ایک ہی سطح کی دو انتہائیں ہیں۔ جوں جوں ہم موت سے دور ہٹتے ہیں بتدریج زندگی کی ایک حالت یعنی خوشی کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم زندگی سے دور ہٹتے ہیں تو احساس زیاں اور دکھ کے ساتھ موت کی طرف سفر کرتے ہیں۔ بقا کی جدوجہد کو سمجھنے کی یہی کلید ہے جو زندگی کے معیار کو بہتر بناتی اور ارتقا کی آخری منزل کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ ''بقائے اصلح'' کا اصول ارتقا کے اس عظیم الشان منصوبہ میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔

یہ امر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ٘ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُۙ ۝ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا١ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُۙ ۝ (الملک: 2،3)

ترجمہ: بس ایک وہی برکت والا ثابت ہوا جس کے قبضۂ قدرت میں تمام بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر جسے چاہے دائمی قدرت رکھتا ہے۔ وہی جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہترین ہے۔ اور وہ کامل غلبہ والا (اور) بہت بخشنے والا ہے۔

دنیا میں دکھ کیوں ہے؟ مندرجہ بالا آیت میں اس سوال کا جواب بڑی وسعت اور وضاحت سے دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں موت و حیات کا گہرا فلسفہ، ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے ان گنت مراتب نیز زندگی کی تشکیل اور اس کا معیار بہتر بنانے میں ان کے کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی وہ ترتیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح فرمائی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی ایک مثبت قدر ہے اور موت سے محض اس کی عدم موجودگی مراد ہے اور ان کے درمیان کوئی حدِّ فاصل نہیں ہے۔ حیات کا موت کی طرف سفر اور زوال پذیری یا دوسرے پہلو سے موت کی حیات کی طرف حرکت اور نتیجۃً طاقت، توانائی اور شعور کا حصول ایک تدریجی عمل ہے۔ یہ تخلیق کا عظیم منصوبہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے: ''کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہترین ہے۔''

یہ موت اور حیات کے مابین پیہم جدوجہد ہے جو جانداروں کو ایک مستقل آزمائش میں مبتلا رکھتی ہے۔ چنانچہ باقی وہی رہتے ہیں جو اپنے طرز عمل سے اپنے آپ کو بہترین ثابت کریں اور اپنی بقا کیلئے بہتر مقام حاصل کر پائیں۔ مذکورہ بالا آیات میں ارتقا کا فلسفہ اور طریق بیان کیا گیا ہے۔ یہ موت اور حیات کی قوتوں کی مسلسل جدوجہد ہی ہے جو جاندار انواع کو مستقلاً موت سے دور لے جانے یا اس کی طرف جانے کی قوت عطا کرتی ہے۔ ارتقائی تبدیلیوں کے وسیع تناظر میں اس کا نتیجہ

کسی وجود کی زندگی کے معیار کی بہتری یا ابتری کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی ارتقا کی اصل روح ہے۔

دکھ کو صرف اس صورت میں قابل اعتراض قرار دیا جاسکتا ہے اگر اسے نظام کائنات میں کوئی بامقصد کردار ادا کئے بغیر ایک علیحدہ وجود کے طور پر پیش کیا جائے۔ لیکن دکھ کے احساس کے اس تجربہ سے گزرے بغیر تو سکون اور آرام کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ رنج اور تکلیف کے بغیر خوشی اور مسرت کا بھی کوئی لطف نہیں رہتا۔ بلا شبہ اس کے بغیر زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور ارتقا کی منازل راستے ہی میں دم توڑ دیں گی۔

چنانچہ حواس خمسہ کے ارتقا میں تکلیف اور سکون کے احساس نے یکساں کردار ادا کیا ہے۔ جیسا کہ گاڑی کے دو پہیے کہ اگر ایک کو الگ کر دیں تو دوسرا بھی بیکار ہو کر رہ جائے گا اور یوں گاڑی کا تصور ہی ختم ہو جائے گا۔ موت و حیات کے مابین یہی کشمکش جو تکلیف کو جنم دیتی ہے، خوشی پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہی بنیادی محرک ارتقا کی گاڑی کو ہمیشہ آگے بڑھنے کی قوت مہیا کرتا ہے۔

ارتقا کی طویل تاریخ میں پائی جانے والی بیماریوں کی مختلف وجوہات بالواسطہ یا بلاواسطہ ارتقائی تبدیلیوں سے ہی متعلق تھیں۔ ماحولیاتی تبدیلیاں، بقا کی جدوجہد، تغیر اور حادثات، سب نے اکٹھے یا الگ الگ اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یعنی بیماریاں، نقائص اور کمزوریاں بھی ترقی پر اثرانداز ہونے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ یوں جانوروں کی مختلف انواع بظاہر لاشعوری طور پر، مگر دراصل ایک رہنما اصول کے تحت شعور کے اعلیٰ مدارج کی طرف ارتقا پذیر ہوتی رہی ہیں۔

اب ہم ایک اور منصوبہ کا جائزہ لیتے ہیں جس میں ایک مفروضہ کے تحت تکلیف کے عنصر کو یکسر ہٹا دینا مقصود ہے۔ بالفاظ دیگر زندگی کی تمام حالتوں کو لازمی طور پر کسی تکلیف کے بغیر خوشی میں برابر کا حصہ ملنا چاہئے۔ مقصد یہ ہے کہ شاید اس طرح ہم تکلیف کو ختم کر کے زندگی کو ایذا سے بچا سکیں۔ تب مطلق مساوات قائم ہو جائے گی اور سب برابر کی سطح پر کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن اس منصوبہ کو کیسے اور کہاں متعارف کروایا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ہم ارتقا کے طویل سلسلہ میں اس منصوبہ کو متعارف کروانے کی کوشش کریں گے ہمیں لازماً بعض لاینحل مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ افسوس کہ یا تو اس نئے منصوبہ کے اصولوں کو ابتدائے آفرینش سے متعارف کروانا ہو گا یا اسے سرے سے ترک کرنا پڑے گا۔ اس قسم کی مطلق مساوات کا اطلاق خواہ کسی بھی سطح پر کیوں نہ کیا جائے، لاینحل تضادات کو جنم دے گا۔ اس کے لئے ہمیں زندگی کے نقطۂ آغاز کی طرف لوٹنا ہو گا۔ ہمیں حیات کی تاریخ میں بالکل وہاں لوٹ جانا ہو گا جہاں سے زندگی کی ابتداء ہوئی اور ارتقا کی سیڑھی کو از سر نو زینہ بہ زینہ تعمیر کرنا ہو گا۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود ہم پہلے مرحلہ پر ہی رُک جائیں گے اور ایک قدم بھی آگے بڑھنے کے قابل نہ ہوں گے کیونکہ خوشی کی مساوی تقسیم اور تکلیف کی کلیۃً عدم موجودگی

ارتقا کی قوت رفتار کو بالکل ختم کر دے گی۔ چنانچہ نہ تو بقا کیلئے کوئی جدوجہد ہو گی اور نہ ہی کوئی انتخاب طبعی اور بقائے اصلح کے اصولوں کا نفاذ۔ اور زندگی کی خام حالت سے ترقی کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جاسکے گا۔

زندگی کے اس مرحلہ کا تصور کیجئے جو انسانی علم کے مطابق تین بنیادی اکائیوں پر مشتمل ہے۔ یعنی مرکزہ والے بیکٹیریا۔ بغیر مرکزہ کے بیکٹیریا اور آگ کی توانائی سے جنم لینے والے پائرو بیکٹیریا۔ اس فرضی نظام میں سب کو برابر میسر آنے کی وجہ سے خوراک یا بالفاظ دیگر بقا کیلئے کوئی مقابلہ نہیں ہو گا اور نہ ہی تکلیف کا وجود ہو گا۔ نتیجۃً اس فرضی نظام میں زندگی ہمیشہ اپنی ابتدائی خام حالت میں ساکت اور جامد رہے گی۔ انسانی تخلیق تو اس نقطۂ آغاز سے دور کی بات ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا اس نظام کو منتخب کیا جائے جس کا اہم جزو دکھ ہے اور جو زندگی کے ارتقا کے عمل کو مسلسل جاری رکھتا ہے یا تکلیف کے خوف سے اس نظام کو بکلی ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ حتمی تجزیہ میں ''زندگی یا موت'' میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ اگر حیات کی ابتدائی حالتوں میں کچھ شعور ہوتا تو حیات اس بے معنی مشقت میں زندہ رہنے کی بجائے موت کو ترجیح دیتی۔

دکھ کا تعلق سزا اور مکافات کے تصور سے بھی ہے۔ حیوانات میں ایک محدود پیمانے پر انتقام لینے کی جبلت مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ یہ جبلت بہت سے زمینی، بحری اور فضائی جانوروں کے رویوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ہاتھی اور بھینس انتقامی جذبہ کی وجہ سے خاصے بدنام ہیں۔ حیات کی اس بتدریج ترقی پذیر خصوصیت کا تعلق لازماً قوت فیصلہ کے بتدریج ارتقاسے ہے۔ کچھ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ یا تو جبلت کے تحت ہو سکتا ہے یا سوچ سمجھ کر۔ تاہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ جانوروں کے طرز عمل میں فیصلہ کی صلاحیت کیا کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ انسان کے طرز عمل میں اس صلاحیت کا بہت اہم کردار ہے۔ یہ فیصلہ عموماً انسان کا اپنا ہوتا ہے کہ آیا وہ نور اور حیات کی طرف حرکت کرے یا ظلمت اور موت کی طرف۔ اس لئے اگر انسان کو اپنے اعمال کے نتیجہ میں کوئی انعام ملے یا سزا بھگتنا پڑے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔

بعض اوقات لوگ تکلیف تو اٹھاتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ خود ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ مگر قدرت میں جزا سزا کا ایک عمومی قانون کارفرما ہے جسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ انہیں اپنے کسی دانستہ یا نادانستہ عمل کے نتیجہ میں وجہ معلوم ہوئے بغیر یہ تکلیف اٹھانا پڑی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر غلطی کی سزا فوری طور پر نہیں ملا کرتی۔ بسا اوقات قانون شکنی پر قدرت غیر محسوس طریق پر سزا دیتی ہے۔

تاہم یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے بلکہ بہت زیادہ الجھا ہوا، وسیع اور پیچیدہ ہے اور اسے بعض فرضی یا حقیقی سائنسی مثالوں کی مدد سے واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض صورتوں میں وضاحت مشکل ہو جاتی ہے۔ مثلاً بعض پیدائشی نقائص والے بچوں کے متعلق یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ انہیں کیوں تکلیف میں ڈالا گیا؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ اگر کہیں کوئی غلطی ہے تو خواہ یہ نادانستہ طور پر ہی ہو، والدین کی ہو سکتی ہے۔ اس سیاق و سباق میں لفظ ''نقص'' کو اس کے وسیع معانی میں سمجھنا چاہئے جس میں حادثاتی واقعات کے نتیجہ میں جنم لینے والی پیدائشی بیماریاں بھی شامل ہیں۔ ایسی غلطیوں کا دانستہ جرائم سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی نقص کی وجہ کچھ بھی ہو، یہ بات یقینی ہے کہ اس نقص کے ساتھ پیدا ہونے والا معصوم بچہ کسی بھی صورت میں اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔

اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ہر تکلیف سزا نہیں اور نہ ہی ہر خوشی جزا ہے۔ کچھ لوگ بغیر کسی وجہ کے تکلیف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ تاہم ایسے معاملات کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہاں بالارادہ ناانصافی کا سوال نہیں بلکہ ایسی تکالیف تخلیق کے وسیع تر منصوبہ کا ناگزیر نتیجہ ہیں اور یہ انسانی معاشرہ کے عمومی ارتقا میں ایک بامقصد کردار ادا کرتی ہیں۔

یاد رکھیں کہ علت اور معلول اور اسی طرح جرم اور سزا، خواہ کتنے ہی مشابہ کیوں نہ دکھائی دیں، دو مختلف امور ہیں۔ یہ کہنا بجا ہو گا کہ جرم ہی ایک سبب ہے جس کے نتیجہ میں سزا ملتی ہے لیکن یہ دعویٰ درست نہیں کہ ہر تکلیف ماضی میں سرزد ہونے والے کسی جرم کی سزا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ تمام صحت مند بچے اپنے والدین کے کسی نیک عمل کے صلہ میں صحت مند ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں کہ ہر بیمار بچہ اپنے آباؤ اجداد یا اپنے والدین کے کسی نامعلوم جرم کے باعث بیمار ہے۔ صحت اور بیماری، اہلیت اور نااہلی، خوش قسمتی اور بدقسمتی، پیدائشی صحت یا معذوری، اپنی ذات میں اثر انداز ہونے کے علاوہ ایک وسیع نظام میں بھی ایک فعّال کردار ادا کرنے کیلئے ضروری ہیں اور جرم اور سزا، اچھائی اور صلہ کے تصور سے نمایاں طور پر الگ ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے راحت کی طرح تکلیف بھی زندگی کے ارتقا کی لازمی اور بنیادی شرط ہے جس کا ارتقا کے اس سفر میں جرم و سزا کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔

تکلیف اپنے فعّال کردار کی وجہ سے ایسے مفید اثرات پیدا کرتی ہے جو اس کی موجودگی کی یاد دلاتے ہیں۔ ہمارے کردار کو سنوارنے کیلئے تکلیف ایک بہترین استاد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ قوتِ ادراک کو ترقی دے کر اسے جلا بخشتی، فروتنی سکھاتی اور کئی طریق سے انسان کو خدا کی یاد دلاتی ہے۔ یہ تحقیق اور جستجو کو بیدار کر کے اس خواہش کو جنم دیتی ہے جو تمام ایجادات کی ماں ہے۔ اگر تکلیف کو جو انسان کی پوشیدہ قوت کا باعث ہے، دور کر دیا جائے تو ارتقا کا پہیہ لاکھوں گنا پیچھے

چلا جائے گا۔ انسان اس قدرتی منصوبہ کو تبدیل کرنے کی کوشش تو کر سکتا ہے مگر سوائے مایوسی کے اسے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ چنانچہ تکلیف اور دکھ کی موجودگی کی وجہ سے خالق کو موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بلکہ ان حالات میں دکھ اور تکلیف کا تو ایک تخلیقی کردار ہے اور یہ زحمت تو دراصل ہمارے لئے رحمت کا باعث ہے۔

ان تمام سائنسی تحقیقات اور دریافتوں کے پس منظر میں تکلیف اور بے آرامی سے چھٹکارا پانے کی ایک مستقل جدوجہد ہے جو کارفرما ہے۔ سائنسی تحقیق اور دریافتوں کے محرکات آرام کے حصول کی خواہش پر اس قدر مبنی نہیں جس قدر تکلیف سے نجات حاصل کرنے پر۔ تعیّش دراصل ہے کیا؟ یہ بے آرامی کی حالت سے نسبتاً آرام کی حالت کی طرف جانے کے رجحان میں وسعت کا نام ہے۔

آیئے ایک بار پھر ان معصوم اور دکھی لوگوں کے معاملہ پر مزید غور کریں۔ مثلاً پیدائشی نقائص کے حامل نومولود بچے یا وہ بچے جو بعد میں ٹائیفائیڈ یا کسی اور معذور کر دینے والی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اندھے، بہرے یا گونگے ہو جاتے ہیں اور جزوی یا مکمل طور پر مفلوج ہو جاتے ہیں۔ جن بچوں کے مرکزی اعصابی نظام کو دوران پیدائش نقصان پہنچ جاتا ہے ان کی حالت مزید بگڑ سکتی ہے اور اس کا نتیجہ دماغی امراض کی صورت میں نکلا کرتا ہے۔ اب کیا یہ سوال درست ہو گا کہ کیوں ایک بچہ مثلاً زید یا بکر تو اس تکلیف میں مبتلا ہے اور عمر یا خالد نہیں؟ علیٰ ہذا القیاس ''الف'' یا ''ب'' کیوں بیمار ہے اور ''ج'' اور ''د'' کیوں نہیں؟ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔ درست سوال صرف یہ ہو سکتا ہے کہ آخر کوئی بھی بچہ اس طرح کیوں بیمار ہوتا ہے؟ اس صورت میں خالق کے پاس ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ یا تو تمام بچوں کو یکساں صحت مند پیدا کرے یا غیر صحت مند۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بچے کی صحت بذات خود ایک نسبتی قدر ہے۔ شاید ہی دو بچے ایسے ملیں جن کی ذہنی و جسمانی صحت اور تمام اعضاء یکساں ہوں۔ دکھ اور تکلیف کے اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے خالق کے متعلق بھی ایک موزوں سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر ایک بچہ جو چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ایک بڑی بھدی سی ناک اور دوسرے غیر متناسب نقوش لے کر پیدا ہوا ہو تو کیا وہ اپنے دوسرے خوش نصیب ساتھیوں کی خوبیاں دیکھ کر عمر بھر دکھی نہیں رہے گا؟

صحت اور شکل و صورت کا یہ اختلاف بہت سے لوگوں کو اذیت میں مبتلا کر دے گا۔ کیا مطلق انصاف اور ایمانداری کا یہ تقاضا نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو صحت اور ظاہری خدوخال میں یکساں پیدا کرتا۔ فکری اور قلبی استعدادوں اور رجحانات کے موازنہ کو بھی شامل کر لیں تو اعلیٰ اور ادنیٰ کا باہمی تضاد بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ دونوں

انتہاؤں کو چھوڑ کر عام انسانوں سے معمولی فرق بھی انصاف کے خلاف دکھائی دینے لگے گا۔ یکسانیت کو ختم کر کے تنوع پیدا کرنے کیلئے آخر کہیں سے تو ابتداء کرنا ہو گی۔ تنوع اور تفاوت کی نسبت سے تکلیف اور راحت بھی لازماً پیدا ہو گی۔ معذور بچوں کیلئے رحم کے نام پر ترتیب کائنات کے خلاف اعتراض اور چیز ہے لیکن اس سکیم کو بظاہر زیادہ ہمدردانہ اور انصاف پر مبنی سکیم سے بدل دینا ایک اور چیز۔ انسان ابتدائے آفرینش سے موجود کائنات کی اس سکیم کو بدلنے کی کوشش تو کر سکتا ہے لیکن اس کا نعم البدل پیش کرنے کے قابل ہر گز نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر ہم اسی سوال کی طرف واپس لوٹتے ہیں کہ کوئی بیماری اور تکلیف آخر ہے کیوں؟ اور یہ کیوں ناگزیر ہے؟ اس سوال کا ایک جواب ہم پہلے ہی اوپر دے چکے ہیں۔

آیئے ایک دہریہ اور ایک مومن کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ منطقی لحاظ سے دہریوں کے لئے نہ تو کوئی حل طلب مسئلہ موجود ہے اور نہ ہی کوئی ایسا سوال جس کا جواب مطلوب ہو۔ کیونکہ بقول ان کے وہ اپنی ہستی کے لئے کسی خالق کے محتاج نہیں۔ نیز اگر انہیں اِس اتفاقی تخلیق میں کوئی نقص نظر آتا ہے تو اصولاً کوئی خالق اُن کے سامنے جوابدہ نہیں۔ ہر تکلیف، ہر شامت اعمال اور ہر خوشی کی غیر مساویانہ تقسیم کیلئے صرف چانس یا اتفاق کو ہی ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے اور اس سے صدیوں پرانی بحث کا خاتمہ ممکن ہے۔ دہریوں کے نزدیک چونکہ اصل خالق چانس یا اتفاق ہے، خواہ اس کا نام نیچر ہی کیوں نہ رکھ لیں جس میں نہ تو شعور ہے نیز یہ بہرا، گونگا، اندھا اور بے ترتیب ہے، اس لئے اگر اس بے ترتیبی میں کوئی نقص رہ جائے تو اسے موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کسی خالق کے بغیر اتفاقیہ پیدائش بغیر کسی ترتیب، دلیل یا سمت کے لازماً اندھی ہو گی۔

جو لوگ خدا تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں جو خالق ہے ان کیلئے اس جامع منصوبہ کی حکمت اور دانائی کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہونی چاہئے کیونکہ انہیں اس تخلیق میں ایک واضح سمت، توازن اور مقصد نظر آتا ہے۔ اتنی مہارت سے ترتیب دیئے گئے اس رنگا رنگ اور معطر گلدستے میں کہیں کوئی ایک آدھ کانٹا بھی موجود ہو تو کیا اسے بدصورت کہا جا سکتا ہے؟

اگر دہریہ کا وہم درست ہو تو معصوم اور دکھی لوگوں کیلئے نجات کا واحد راستہ صرف موت ہے۔ لیکن تخلیق کے بارہ میں اگر مومن کا نظریہ درست ہو تو اس صورت میں موت ایک بالکل مختلف انداز میں نجات دہندہ بن جاتی ہے۔ ان کیلئے موت ایک نئی زندگی کی ابتداء ہے جو ان مبتلائے آزار معصوم لوگوں پر لامحدود جزا کے دروازے کھول دیتی ہے۔ اگر وہ اس جزا کا تصور کر سکتے ہوں جو اس دنیوی زندگی میں پہنچنے والی عارضی اذیت کی تلافی کے طور پر ان کی منتظر ہے تو وہ اذیت

کے باوجود مسکراتے ہوئے زندگی بسر کریں۔ گویا یہ تکلیف ایک کانٹے کی ہلکی سی چبھن کی مانند ہے جو راحت اور خوشی کی ابدی زندگی کے رستے میں انہیں اٹھانا پڑی ہے۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ پھر بھی مطمئن نہ ہوں اور مُصر ہوں کہ چونکہ نہ کوئی خدا ہے اور نہ ہی موت کے بعد کوئی جزا سزا، اس لئے ان کے نزدیک اس جواب کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر ایسا ہے تو اس سوال پر بحث فضول ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سوال صرف اس صورت میں ہی زیر بحث لایا جاسکتا ہے جب پہلے خدا تعالیٰ کو خالق تسلیم کر لیا جائے۔ اخلاقیات اور کسی امر کے اچھا یا برا ہونے کا سوال صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ہستیٔ باری تعالیٰ پر ایمان بھی ہو۔ اگر خدا ہے تب ہی مذکورہ بالا طریق سے تلافی ممکن ہے اور اسے ہنس کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ اور اگر خدا نہیں ہے تو اتفاقی طور پر پہنچنے والی اذیت پر کسی کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ اس صورت میں ہمیں زندگی اور متعلقہ امور کو محض ایک بے معنی، بے سمت اور بے مقصد اتفاقی سانحہ کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔ اور دکھ یا اذیت کو قدرت کے ایک ایسے جزو لاینفک کے طور پر قبول کرنا ہوگا جس سے مفر نہیں اور انسان کو ہر صورت میں اذیت کے ساتھ زندگی گزارنے کا فن سیکھنا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اذیت ارتقا کی قوت متحرکہ کا نہایت اہم جزو ہے۔ تاہم اس امر کا فیصلہ ہونا باقی ہے کہ ہستی کے شعور سے حاصل ہونے والی لذت اور اذیت کا توازن کیسے برقرار رکھا جائے؟ لذت اور اذیت کی اس سادہ مساوات میں اگر رنج و اَلم کا پلہ بھاری رہے تو اکثریت ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دے گی۔ اگر رنج و اَلم میں مبتلا لوگوں کی اکثریت دکھ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی بجائے شعوری سطح پر اپنی شناخت کو ضائع کرنا ہی پسند کرے گی تو اس صورت میں کائنات کے اس منصوبہ کی حکمت ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ حالانکہ حقیقی زندگی میں ہمارا مشاہدہ مندرجہ بالا مفروضہ کے بالکل برعکس ہے۔ زندگی بسا اوقات اپنے وجود کے شعور کے ساتھ ہر قیمت پر چمٹی رہتی ہے خواہ کتنی ہی تکلیف اور دکھ کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔ غالب اصول تو یہی ہے تاہم بعض استثنائی صورتیں ہیں جو شاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ رنج و اَلم کا تناظر بدلتا رہتا ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو زاویہ ہائے نگاہ کے بدلنے سے بدل جاتا ہے۔ صحت مند لوگ کسی معذور بچے کی حالت کو انتہائی تکلیف دہ خیال کرتے ہیں لیکن وہ جو اس بچے سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالت میں ہیں ان کے لئے اس کی یہ حالت قابل رشک ہوتی ہے۔

وسیع تر تناظر میں زندگی کی ہر صورت اپنے سے نیچے یا اوپر کی حالتوں سے بالترتیب بہتر یا کمتر نظر آتی ہے۔ ارتقا کے سفر میں ہمارا اقدار کا شعور بھی ادنیٰ سے اعلیٰ حالتوں کی طرف تبدیل ہوتا چلا گیا ہے۔ اگر ارتقا کے اس ہمہ وقت ترقی

پذیر رستے میں بلندی پر واقع مراحل کو کسی بلند تر مقام سے دیکھا جائے تو وہ بھی نسبتاً پست دکھائی دیتے ہیں۔ حیات کی اعلیٰ حالتوں کا ان قدروں سے چولی دامن کا ساتھ ہے جن کا شعور ارتقا کے طویل عمل کے دوران حاصل ہوا۔ اقدار کی اس آگہی اور استعدادوں میں کسی قسم کی کمی یقیناً ایسی اذیت پر منتج ہو گی جو بذات خود ان کی ترقی کیلئے ناگزیر ہے۔ اگر کیڑے کی زندگی کا حیات کی بعض اعلیٰ حالتوں سے موازنہ کریں اور پھر ان کا موازنہ جانوروں کی بعض مزید ترقی یافتہ انواع سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سب کی استعدادیں یکساں نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر گلے سڑے نامیاتی مادہ اور گندگی پر پلنے والے کیڑے کسی صورت میں بھی اپنے آپ کو گھاس کے وسیع میدانوں میں آزادی سے گھومتے پھرتے اور نرم گھاس چرتے ہوئے جنگلی گھوڑوں سے بہتر قرار نہیں دے سکتے۔ نہ ہی وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ان سے گھٹیا اور کم تر درجہ رکھتے ہیں۔ ہر دو انواع کے مختلف جہان ہیں مختلف صلاحیتیں، مختلف ضروریات اور مختلف خواہشات ہیں بشرطیکہ کیڑے بھی خواہشات رکھتے ہوں۔

تاہم یہ عدم توازن کسی ناانصافی پر دلالت نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر چند ایسے ہٹے کٹے کیڑوں کا تصور کیجئے جو بظاہر اپنے ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں اور اپنی موجودہ صلاحیتوں پر قانع ہوں اور نہ ہی اپنے محسوسات سے ہٹ کر کوئی خواہش کر سکتے ہوں۔ اس کے باوجود اگر اذیت میں مبتلا بچے کو کسی کیڑے کی خوشحال زندگی سے بدلنے کی پیشکش کی جائے تو کیا وہ اس پر موت کو ترجیح نہیں دے گا؟

محض انسانی زندگی اور اس زندگی کی ان اعلیٰ حالتوں کا شعور جن سے اسے نوازا گیا ہے، ہی بالعموم اذیت کے احساس کو کم کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اذیت بہرحال ایک نسبتی حالت ہے۔ اذیت کی بنیادی وجہ احساس محرومی ہے۔ جب معروف اور پسندیدہ اقدار کو نقصان پہنچتا ہے تو اذیت کا شعور جنم لیتا ہے۔

یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب انسان ان اقدار کی لذت کا مزہ چکھ چکا ہو یا دوسروں کو ان سے لطف اندوز ہوتے دیکھ چکا ہو۔ چنانچہ ان اقدار میں کمی جن سے کبھی وہ خود لطف اندوز ہو چکا ہو یا اوروں کو ان قدروں سے لطف اندوز ہوتا دیکھے لیکن خود اس لذت سے محروم ہو، یہ دونوں ایسے مضبوط عوامل ہیں جو اذیت کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ البتہ ان اقدار کی عدم موجودگی اذیت کا باعث نہیں بن سکتی جن کا انسان کو علم ہی نہ ہو۔ لہٰذا اگر اذیت محض کسی محرومی کی علامت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس حقیقت کے باوجود کہ اذیت کا ذمہ دار خاص صدمات کو ہی قرار نہیں دیا جا سکتا، گہرے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اذیت کا ہر احساس دراصل کسی محرومی کے احساس ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

حواس کی تخلیق اور ارتقا، سود و زیاں، لذت اور اذیت کی اس لمبی اور نہ ختم ہونے والی کشمکش ہی کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں وہ موثر ترین مخفی تخلیقی عوامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ہمارے حواس خمسہ انہی عوامل کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہیں جو لاکھوں سالوں پر محیط ارتقا کے عمل کے دوران بتدریج معرض وجود میں آ گئے۔ راحت اور اذیت بذات خود نظام شعور کی تخلیق کا باعث نہیں ہیں۔ تکلیف اور خوشی از خود اعصابی نظام تخلیق نہیں کر سکتے۔ اور اس شعوری نظام کی عدم موجودگی میں کسی راحت و اذیت کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ عدم سے وجود کیونکر ممکن ہے؟ عدم شعور اربوں کھربوں سالوں میں بھی شعور کی نہ تو تخلیق کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تشکیل۔

اس کے لئے ایک باشعور خالق کی ضرورت ہے جو موت کو شعور عطا کرے اور اس سے زندگی پیدا کرے۔ یوں لگتا ہے جیسے خالق کل نے ایک ایسے طریق پر جو اب تک ایک سربستہ راز ہے لذت اور اذیت کو ان اعضاء کی تخلیق کے لئے استعمال کیا ہے جو لذت و اذیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اس حیرت انگیز شاہکار کی تخلیق میں اذیت کے کردار کو ختم کر دینے سے زندگی اپنے آپ سے محض ایک بیگانہ اور بے حس نباتاتی مواد کی صورت میں رہ جائے گی۔ شعور کی اس حیرت انگیز صلاحیت کے مقابل پر اذیت اور محرومی کی محدود اور استثنائی مثالیں کیا کوئی مہنگا سودا ہے؟

<u>یاد رکھیں</u> کہ اسلام کے نزدیک بدی ایک ایسا سایہ ہے جو روشنی کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتا ہے۔ بذات خود اس کا کوئی مثبت وجود نہیں۔ روشنی کے ماخذ کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مثلاً لیمپ یا سورج مگر تاریکی کے ماخذ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی چیز اندھیرے کا ماخذ اس وقت بنتی ہے جب اس میں روشنی کو روکنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اسی طرح یہ نیکی کی عدم موجودگی ہی ہے جو بدی کہلاتی ہے اور بدی کے مختلف مدارج کا انحصار نیکی روکنے والے واسطے کی کثافت پر ہے۔

کسی چیز کو حاصل کر لینے کا شعور ہی لذت کہلاتا ہے اور اس چیز کا نقصان یا کھو دینے کا اندیشہ درد یا اذیت کہلائے گا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں دو انتہاؤں کے طور پر بیک وقت موجود رہیں۔ یعنی ایک کو ختم کرنے سے دوسرا خود بخود ختم ہو جائے گا۔ نتیجۃً کوئی شخص بھی اذیت اور لذت، نیکی اور بدی کے اس تخلیقی نظام میں نہ تو دخل اندازی کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے تبدیل کرنے پر قادر ہے۔ یہ انسانی ہمدردی کے بس سے باہر ہے کہ وہ زندگی کو ختم کئے بغیر اذیت کو ختم کر سکے۔"

(از اردو ترجمہ "Revelation, Rationality, Knowledge and Truth"، (الہام، عقل، علم اور سچائی) صفحہ 157 تا 168 انگلستان 2007ء)

اسلام کا ایک امتیاز

خِلَافَت عَلٰی مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ

خلافت کی اہمیت، قیام اور انتخاب

(ابن قدسی)

اسلام متنوع صورتوں میں دیگر مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کی ایک صورت اس طرح بھی ہے کہ بانی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور امت محمدیہ میں پیدا ہونے والے فتن نیز بیرونی حملوں کا ذکر پیش خبریوں کے طور پر بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ انہیں پیش خبریوں اور پیشگوئیوں کے مطابق ظاہر ہونے والے واقعات بتاتے ہیں کہ بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خبریں علیم وخبیر خدا نے بتائی تھیں۔ ایک لحاظ سے یہ بھی اسلام کی سچائی پر ایک دلیل ہے۔

رسول کریم ﷺ نے امت محمدیہ میں واقع ہونے والے قیامت تک کے حالات کا تذکرہ پیشگوئی کے رنگ میں یوں بیان فرمایا:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کچھ عرصہ تک نبوت قائم رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے اسے اٹھالیں گے۔ نبوت کے بعد اس کے منہج پر اللہ کی مرضی کے مطابق کچھ عرصہ تک خلافت ہو گی، پھر اللہ تعالیٰ اسے ختم کردیں گے، پھر اللہ کے فیصلے کے مطابق کچھ عرصہ تک بادشاہت ہوگی، جس میں ظلم و زیادتی ہوگی، بالآخر وہ بھی ختم ہوجائے گی، پھر جبری بادشاہت ہوگی، وہ کچھ عرصہ کے بعد زوال پذیر ہوجائے گی، اس کے بعد منہج نبوت پر پھر خلافت ہوگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہوگئے۔ (اس حدیث کے متن کے لئے اس شمارہ کا صفحہ نمبر 6 ملاحظہ فرمائیں)

(مسند الامام احمد بن حنبل جلد 6 صفحہ 285 مسند النعمان بن بشیر حدیث 18596، عالم الکتب بیروت 1998ء)

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اس پیشگوئی کے مطابق ہی حالات وواقعات رونما ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ دور اولین میں خلافت علی منہاج النبوت کے قیام اور اس کے بعد بادشاہتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ بادشاہتوں کے ادوار کا تذکرہ چھوڑتے ہوئے صرف خلافت علیٰ منہاج النبوت پر نظر ڈالی جائے تو اسلام کی صداقت عیاں ہو جاتی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس خلافت کو قائم فرمایا اور اس کے ذریعہ اسلام کو غیر معمولی ترقیات عطا فرمائیں۔ ترقیات کے وسیع تر مضامین کو سمیٹنے کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں اس لیے یہاں صرف خلافت کے قیام کے کچھ پہلو ہی لیے جائیں گے۔

احادیث و تاریخ کی کتب کو ایک خاص اور ظاہری پہلو سے مدّ نظر رکھ کر دیکھا جائے تو انتخاب خلافت اور قیام خلافت کا یہ رنگ نظر آتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد صحابہؓ آپ ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے تو انصار کے کچھ لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں امیر منتخب کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ جب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ بھی ادھر پہنچ گئے۔ امیر مقرر کرنے پر مشاورت شروع ہوئی اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ انصار میں سے کسی نے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک قریش میں سے۔ حالات کچھ ایسے بن گئے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے خلیفہ کے لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا نام تجویز کیا اور ان کی بیعت کر لی گئی اور اس کے بعد مدینے کے لوگوں کی اکثریت نے اپنی خوشی سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کو نامزدگی سے متعلق اکابر صحابہؓ کی رائے جاننے کے لیے مشورہ کیا۔ کبار صحابہ کے اتفاق کرنے پر حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ نامزد کیا۔

حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو آپ کے دورِ خلافت کے آخری سال حج کے دنوں میں ایک شخص نے کہا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا، کیونکہ ابو بکر صدیقؓ کی بیعت بھی تو اچانک ہی ہوئی تھی اور وہ کامیاب ہو گئی۔ یہ بات حضرت عمرؓ تک پہنچی تو مدینہ جا کر آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں خلافت کے حوالے سے تاریخ ساز خطبہ دیا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم میں سے کوئی کہتا ہے ''اگر عمرؓ مر جائیں گے تو میں فلاں کی بیعت کرلوں گا۔'' تمہیں کوئی شخص یہ کہہ کر دھوکہ نہ دے کہ ابو بکرؓ کی بیعت ہنگامی حالات میں ہوئی اور پھر کامیاب ہو گئی، سن لو کہ وہ ایسی ہی تھی لیکن اللہ نے اس (طرح کی) بیعت کے شر سے (امت کو) محفوظ رکھا۔ پھر تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس میں ابو بکرؓ جیسی فضیلت ہو، جس سے ملنے کے لیے لوگ سفر کرتے ہوں... اس کے علاوہ اس خطبہ میں حضرت عمرؓ نے کہا کہ اب جس کسی نے مسلمانوں سے مشورے کے بغیر کسی کی بیعت کی تو بیعت کرنے والا اور جس کی بیعت کی گئی ہو دونوں اپنی جانیں گنوا بیٹھیں گے۔

جب حضرت عمرؓ کو زخمی کیا گیا تو لوگوں نے آپؓ کو خلیفہ مقرر کرنے کا کہا تو آپؓ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت فرمائے گا اور اگر میں خلیفہ مقرر کروں تو مجھ سے بہتر و افضل حضرت ابو بکرؓ مقرر کر چکے ہیں اور اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر نہ کروں تو مجھ سے بہتر و افضل رسول اللہ ﷺ نے بھی کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا تو میں جان گیا کہ آپؓ کسی کو خلیفہ نامزد نہیں فرمائیں گے۔

جب حضرت عمرؓ آخری وصیتیں فرما رہے تھے تب لوگوں نے عرض کیا امیر المومنین کسی کو خلیفہ بنا دیں حضرت عمرؓ نے کہا کہ میرے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ کوئی خلافت کا مستحق نہیں ہے جن سے رسول اللہ ﷺ انتقال کے وقت راضی تھے پھر آپ نے حضرت علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ، عبد الرحمنؓ بن عوف کا نام لیا اور فرمایا کہ عبد اللہ بن عمرؓ تمہارے پاس حاضر رہا کریں گے مگر خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد وہ لوگ جو حضرت عمرؓ کی نظر میں خلافت کے مستحق تھے جمع ہوئے۔ ان چھ صحابہؓ نے اتفاق رائے سے اپنے میں سے تین لوگ منتخب کر لیے۔ پھر ان تینوں نے اتفاق رائے سے خلیفہ تجویز کرنے کا اختیار حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کو دے دیا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف نے بہت سوچ بچار، عام لوگوں کا رجحان کس طرف ہے اور کئی صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ مقرر کرنے کے لئے حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف نے اکابرین سے بھی ، ان کے پیروکاروں سے بھی، اجتماعاً بھی اور متفرق طور پر بھی۔ اکیلے اکیلے سے بھی اور دو دو سے بھی۔ خفیہ بھی اور اعلانیہ بھی، حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی مشورہ کیا۔ مزید براں مدرسے کے طالب علموں سے بھی اور مدینہ کی طرف آنے والے سواروں سے (حج سے واپس گزرتے ہوئے قافلوں سے بھی دریافت کیا) بدووں سے بھی جنہیں وہ مناسب سمجھتے۔ تین دن اور تین راتیں یہ مشورہ جاری رہا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ ان تین دن اور تین راتوں میں بہت کم سوئے۔ وہ اکثر وقت نماز، دعا، استخارہ اور ان لوگوں سے مشورہ میں گزارتے تھے جن کو وہ مشورہ کا اہل سمجھتے۔ آخر اس استصوابِ عام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثر لوگ حضرت عثمانؓ کے حق میں ہیں۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت باغی اور شورش پسند عنصر مدینہ پر چھایا ہوا تھا۔ انہوں نے شہر کی ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ پورے شہر کا نظم و نسق باغیوں میں سے ہی ایک شخص غافقی بن حرب کے ہاتھ میں تھا۔ یہی شخص 5 دن تک امامت کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ شر پسندوں کا یہ گروہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دینے تک تو متفق تھا لیکن آئندہ خلیفہ بنانے میں ان میں اختلاف تھا۔ مصری حضرت علیؓ کو، کوفی حضرت زبیرؓ کو اور بصری حضرت طلحہؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔

لیکن ان تینوں حضرات نے انکار کر دیا۔ پھر یہ لوگ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس بھی گئے لیکن ان دونوں حضرات نے بھی صاف انکار کر دیا۔

معتبر روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اور دوسرے اہلِ مدینہ ان (حضرت علیؓ) کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ " یہ نظام کسی امیر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، لوگوں کے لیے ایک امام کا وجود ناگزیر ہے، اور آج آپ کے سوا ہم کوئی ایسا شخص نہیں پاتے جو اس منصب کے لئے آپ سے زیادہ مستحق ہو، نہ سابق خدمات کے اعتبار سے، اور نہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قُرب کے اعتبار سے۔" انہوں نے انکار کیا اور لوگ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے کہا "میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی، عام مسلمانوں کی رضا کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔" پھر مسجد نبویؐ میں اجتماع عام ہوا اور تمام مہاجرین اور انصار نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صحابہؓ میں سے 17 یا 20 ایسے بزرگ تھے جنہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔

مندرجہ بالا تمام تر تفاصیل کتب احادیث (صحیح بخاری وغیرہ) اور کتب تاریخ (طبری، ابن اثیر، البدایہ والنہایہ وغیرہ) میں موجود ہیں اور یکجائی شکل میں خلافت وملوکیت از مولانا مودودی اور خلافت وجمہوریت از عبد الرحمٰن کیلانی میں مل جائے گی۔

ان تفاصیل کو سرسری نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے خلیفہ کا انتخاب ایک جمہوری طرز پر معلوم ہوتا ہے۔ کبھی چند اور کبھی مسلمانوں کی موجود اکثریت کسی ایک شخص کے ہاتھ پر جمع ہو جاتے ہیں اور پھر عام مسلمان بھی خلیفۃ المسلمین کی بیعت کر لیتے ہیں۔ اب بظاہر یہ انتخاب باہم مشورہ کر کے، دلائل کے تبادلے اور گفتگو کے بعد ہوتا ہے لیکن خلافت کا مقام و مرتبہ اپنی جگہ بلند قامتی کا حامل ہے۔

ان سطور کو پڑھنے کے بعد یہی تاثر بنتا ہے لوگوں کے مشورہ اور رائے سے خلافت کا قیام ہو رہا تھا لیکن اصل میں وہ نظام اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق تھا۔ دراصل مومنین کی رائے سے قائم ہونے والا نبوت کی طرز پر خلافت کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی خاص تقدیر اور تائید سے قائم ہوا تھا۔

اس مضمون کی سب سے پہلی تائید قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ

كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔(النور: 56)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے ان سے اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا اور ان کے لئے ان کے دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ضرور تمکنت عطا کرے گا اور ان کی خوف کی حالت کے بعد ضرور انہیں امن کی حالت میں بدل دے گا وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے جو اس کے بعد بھی ناشکری کرے تو یہی وہ لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔(ترجمہ از ترجمۃ القرآن حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ)

ایمان اور عمل صالح کی شرط کے ساتھ خلافت کا قیام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گا اور وہ خلافت ان علامات کو پورا کرے گی جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں۔ فتنوں کے دور میں یہ خلافت امن اور تمکنت دین کا باعث ہو گی۔ ایک حدیث میں ذکر ہے کہ

"حضرت عِربَاض بن سَارِیَہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمیں نماز فجر کے بعد ایک موئثر نصیحت فرمائی جس سے لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور دل لرز گئے، ایک شخص نے کہا: یہ نصیحت ایسی ہے جیسی نصیحت دنیا سے (آخری بار) رخصت ہو کر جانے والے کیا کرتے ہیں، تو اللہ کے رسول! آپؐ ہمیں کس بات کی وصیت کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: میں تم لوگوں کو اللہ سے ڈرتے رہنے، امیر کی بات سننے اور اسے ماننے کی نصیحت کرتا ہوں، اگرچہ تمہارا حاکم اور امیر ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ تم میں سے آئندہ جو زندہ رہے گا وہ (امت کے اندر) بہت سارے اختلافات دیکھے گا تو تم (باقی رہنے والوں) کو میری وصیت ہے کہ نئے نئے فتنوں اور نئی نئی بدعتوں میں نہ پڑنا، کیونکہ یہ سب گمراہی ہیں۔ چنانچہ تم میں سے جو شخص ان حالات کو پالے فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تو اسے چاہیئے کہ وہ میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت پر قائم اور جما رہے اور میری اس نصیحت کو اپنے دانتوں کے ذریعے مضبوطی سے دبالے۔" (یعنی اس پر عمل پیرا رہے)

(جامع ترمذی کتاب العلم باب ماجاء فی الأخذ بالسنۃ واجتناب البدعۃ حدیث: 2676)

رسول کریم ﷺ نے اپنے بعد فتنوں کا ذکر فرمایا لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا۔ گویا خلفائے راشدین کی پیروی سے گمراہی سے بچا جاسکتا ہے۔ یہ وہی خلفائے راشدین ہیں جن کے طرز انتخاب کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔

ایمان اور عمل صالح کرنے والوں سے خلافت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ جب تک ایمان اور عمل صالح ہے خلافت کی

نعمتوں سے متمتع ہونا مقدر رہے۔ ایمان اور عمل صالح کی کمی خلافت سے دوری کا باعث بن جاتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اپنے معاًبعد خلافت علی منہاج النبوت کے قیام کا ذکر فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی پیشگوئی بیان فرمائی کہ یہ خلافت حقہ کتنا عرصہ قائم رہے گی۔

سنن ابو داؤد میں روایت ہے:

عَنْ سَفِينَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خِلَافَةُ النُّبُوَّةِ ثَلَاثُونَ سَنَةً، ثُمَّ يُؤْتِي اللهُ الْمُلْكَ أَوْ مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ، قَالَ سَعِيدٌ: قَالَ لِي سَفِينَةُ: أَمْسِكْ عَلَيْكَ أَبَا بَكْرٍ سَنَتَيْنِ، وَعُمَرَ عَشْرًا، وَعُثْمَانَ اثْنَيْ عَشَرَ وَعَلِيٌّ كَذَا۔ (سنن ابو داؤد کتاب السنة باب فی الخلفاء حدیث: 4646)

حضرت سَفِینَۃؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (خلافت علی منہاج النبوۃ) نبوت کی خلافت تیس سال رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ سلطنت یا اپنی سلطنت جسے چاہے گا دے گا۔ سعید کہتے ہیں: سَفِینَۃ نے مجھ سے کہا: اب تم شمار کر لو: ابو بکرؓ دو سال، عمرؓ دس سال، عثمانؓ بارہ سال، اور علیؓ اتنے سال۔

یہ خلافت کتنا عرصہ رہے گی اس کا ذکر جامع ترمذی میں یوں ہے:

سَفِينَةُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ سَنَةً۔ ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ۔

حضرت سَفِینَۃؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں تیس سال تک خلافت رہے گی، پھر اس کے بعد ملوکیت آجائے گی۔ (جامع ترمذی کتاب الفتن باب ماجاء فی الخلافة حدیث: 2226)

اور یہ تیس سال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تک پورے ہو جاتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کو اپنے بعد قائم ہونے والی اس خلافت علی منہاج النبوت کے حوالے سے تقدیر الٰہی کا علم دے دیا گیا تھا۔ بظاہر مشورہ اور رائے سے ہی خلافت کا قیام ہوا لیکن اس کے پس پردہ تقدیر الٰہی اپنا کام کر رہی تھی۔ بظاہر مومنین کا ہی انتخاب تھا لیکن سب اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہو رہا تھا۔ پڑھنے والوں کو تو نظر آ رہا تھا کہ سقیفہ بنو ساعدہ میں چند اصحاب جمع ہوئے اور انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام حضرت ابو بکر صدیقؓ نے تجویز کیا اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے کے بعد نامزد کر دیا یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد چھ رکنی کمیٹی میں سے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے مشورہ اور رائے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کیا یا مخصوص حالات کے باعث لوگوں کے کہنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت لی۔ بظاہر ایسا ہی ہوا لیکن اصل

میں یہ انتخاب اللہ تعالیٰ کا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کریم ﷺ کو خلافت علی منہاج النبوت کے قیام اور اس کے تیس تک قائم رہنے کے متعلق بھی بتایا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس خلافت کے مسند پر متمکن ہونے والوں کے متعلق بھی آگاہی دے دی گئی تھی۔

سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو جن دس احباب کے متعلق خبر دی گئی کہ وہ جنت میں داخل ہونگے۔ وہ دس احباب کون ہیں؟ روایت میں ہے کہ:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَبُو بَكْرٍ فِي الْجَنَّةِ، وَعُمَرُ فِي الْجَنَّةِ، وَعُثْمَانُ فِي الْجَنَّةِ، وَعَلِيٌّ فِي الْجَنَّةِ، وَطَلْحَةُ فِي الْجَنَّةِ، وَالزُّبَيْرُ فِي الْجَنَّةِ، وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ فِي الْجَنَّةِ، وَسَعْدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَسَعِيدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَأَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فِي الْجَنَّةِ۔ (جامع ترمذی کتاب المناقب باب مناقب عبدالرحمٰن بن عوف حدیث: 3747)

حضرت عبد الرحمان بن عوفؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو بکر جنتی ہیں، عمر جنتی ہیں، عثمان جنتی ہیں، علی جنتی ہیں، طلحہ جنتی ہیں، زبیر جنتی ہیں، عبد الرحمٰن بن عوف جنتی ہیں، سعد جنتی ہیں، سعید (سعید بن زید) جنتی ہیں اور ابو عبیدہ بن جراح جنتی ہیں۔ (رضی اللہ علیہم اجمعین)

ان دس جنتی احباب میں چاروں خلفائے راشدین بھی شامل ہیں۔ پہلے تینوں خلفاء کے حوالے سے الگ ایک روایت میں اس طرح بھی ذکر موجود ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے باغوں میں سے ایک باغ میں ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے آپؐ کے پاس جو لکڑی تھی اس (کی نوک) کو پانی اور مٹی کے درمیان مار رہے تھے کہ ایک شخص نے (باغ کا دروازہ) کھولنے کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دروازہ کھول دو اور اس (آنے والے) کو جنت کی خوشخبری سنا دو۔ (ابو موسیٰؓ نے) کہا: وہ ابو بکرؓ تھے، میں نے ان کے لئے دروازہ کھولا اور انہیں جنت کی بشارت دی، پھر ایک اور شخص نے دروازہ کھولنے کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دروازہ کھول دو اور اسے (بھی) جنت کی خوشخبری سنا دو۔ میں گیا تو وہ حضرت عمرؓ تھے۔ میں نے ان کے لئے دروازہ کھولا اور انہیں جنت کی بشارت دی، اس کے بعد ایک اور شخص نے دروازہ کھولنے کی درخواست کی، کہا: تو آپؐ (سیدھے ہو کر) بیٹھ گئے، پھر فرمایا: دروازہ کھولو اور فتنے پر جو (برپا) ہو گا، انہیں جنت کی خوشخبری دے دو۔ کہا: میں گیا تو وہ عثمان بن عفانؓ تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور انہیں جنت کی خوشخبری دی اور آپؐ نے جو کچھ فرمایا تھا انہیں بتایا۔ انہوں نے کہا: اے اللہ صبر عطا فرما یا کہا اللہ ہی ہے جس

سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

(صحیح بخاری کتاب الادب باب من نکت العود فی الماء والطین حدیث: 6216)و(صحیح مسلم کتاب الفضائل باب من فضائل عثمان بن عفان حدیث: 2403)

بعد میں اسی ترتیب سے خلافت کا قیام ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں فتنے برپا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کریم ﷺ کے بعد قائم ہونے والی خلافت کی خبریں اس طرح بھی بیان ہوئیں:

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک اَبَر کا ٹکڑا ہے جس سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے، میں دیکھتا ہوں کہ لوگ انہیں اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں۔ کوئی زیادہ اور کوئی کم اور ایک رسی ہے جو زمین سے آسمان تک لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اسے پکڑا اور اوپر چڑھ گئے پھر ایک دوسرے صاحب نے بھی اسے پکڑا اور وہ بھی اوپر چڑھ گئے پھر ایک تیسرے صاحب نے پکڑا اور وہ بھی چڑھ گئے پھر چوتھے صاحب نے پکڑا اور وہ بھی اس کے ذریعہ چڑھ گئے۔ پھر وہ رسی ٹوٹ گئی، پھر جڑ گئی۔ ابو بکرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے میں اس کی تعبیر بیان کر دوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیان کرو۔ انہوں نے کہا اَبَر کے ٹکڑے سے مراد دین اسلام ہے اور شہد اور گھی ٹپک رہا تھا وہ قرآن مجید کی شیرینی ہے اور بعض قرآن کو زیادہ حاصل کرنے والے ہیں، بعض کم اور آسمان سے زمین تک کی رسی سے مراد وہ سچا طریق ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قائم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پکڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ اس کے ذریعہ اللہ آپؐ کو اٹھا لے گا پھر آپؐ کے بعد ایک دوسرے صاحب آپؐ کے خلیفہ اوّل اسے پکڑیں گے وہ بھی مرتے دم تک اس پر قائم رہیں گے۔ پھر تیسرے صاحب پکڑیں گے ان کا بھی یہی حال ہو گا۔ پھر چوتھے صاحب پکڑیں گے تو ان کا معاملہ خلافت کا کٹ جائے گا وہ بھی اوپر چڑھ جائیں گے۔ یارسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں مجھے بتائیے کیا میں نے جو تعبیر دی ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض حصہ کی صحیح تعبیر دی ہے اور بعض کی غلط۔ ابو بکرؓ نے عرض کیا: پس واللہ! آپؐ میری غلطی کو ظاہر فرما دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم نہ کھاؤ۔ (صحیح بخاری کتاب التعبیر باب من لم یر الرؤیا لأول عابر اذا لم یصب حدیث: 7046)

اس روایت میں خلفاء کا عدد چار بیان ہوا۔ ایک روایت اس طرح بھی ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا: تم میں سے کس نے خواب دیکھا ہے؟ ایک آدمی نے کہا: میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو اترا، آپؐ اور ابو بکرؓ تولے گئے تو آپؐ ابو بکرؓ سے بھاری نکلے، ابو بکرؓ اور عمرؓ تولے گئے، تو ابو بکرؓ بھاری نکلے، عمرؓ اور عثمانؓ تولے گئے تو عمرؓ بھاری نکلے، پھر ترازو اٹھا لیا گیا۔ (جامع ترمذی کتاب الرؤیا باب ما جاء فی رؤیا النبیﷺ فی المیزان والدّلوِ حدیث: 2287)

پھر سنن ابو داؤد میں اس طرح ذکر ہے کہ ایک شخص نے کہا: اللہ کے رسولؐ! میں نے دیکھا گویا کہ آسمان سے ایک ڈول لٹکایا گیا پہلے ابو بکرؓ آئے تو اس کی دونوں لکڑیاں پکڑ کر اس میں سے تھوڑا سا پیا، پھر عمرؓ آئے تو اس کی دونوں لکڑیاں پکڑیں اور انہوں نے خوب سیر ہو کر پیا، پھر عثمانؓ آئے اور اس کی دونوں لکڑیاں پکڑیں اور خوب سیر ہو کر پیا، پھر علیؓ آئے اور اس کی دونوں لکڑیاں پکڑیں، تو وہ چھلک گیا اور اس میں سے کچھ ان کے اوپر بھی پڑ گیا۔

(سنن ابو داؤد کتاب السنۃ باب فی الخلفاء حدیث: 4637)

غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو صرف خلافت علی منہاج النبوت کی ہی خبر نہیں دی بلکہ ترتیب کے ساتھ ان خلفاء کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اور صرف ان خلفاء کے ناموں سے ہی آگاہ نہیں فرمایا تھا بلکہ ان خلفاء کے ادوار میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بطور پیشگوئی بتا دیا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت حذیفہؓ سے ایک روایت ہے کہ:

ہم حضرت عمرؓ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے پوچھا: تم میں سے کسی کو فتنہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد ہے؟ حذیفہؓ نے کہا کہ انسان کا فتنہ (آزمائش) اس کی بیوی، اس کے مال، اس کے بچے اور پڑوسی کے معاملات میں ہوتا ہے جس کا کفارہ نماز، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر دیتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اس کے متعلق نہیں پوچھتا بلکہ اس فتنہ کے بارے میں پوچھتا ہوں جو دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارے گا۔ حذیفہؓ نے بیان کیا کہ امیر المؤمنینؓ آپ پر اس کا کوئی خطرہ نہیں اس کے اور آپ کے درمیان ایک بند دروازہ رکاوٹ ہے۔ عمرؓ نے پوچھا کیا وہ دروازہ توڑ دیا جائے گا یا کھولا جائے گا؟ بیان کیا توڑ دیا جائے گا۔ عمرؓ نے اس پر کہا کہ پھر تو وہ کبھی بند نہ ہو سکے گا۔ میں نے کہا جی ہاں۔ ہم نے حذیفہؓ سے پوچھا: کیا عمرؓ اس دروازہ کے متعلق جانتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں، جس طرح میں جانتا ہوں کہ کل سے پہلے رات آئے گی کیونکہ میں نے ایسی بات بیان کی تھی جو بے بنیاد نہیں تھی۔ ہمیں ان سے یہ پوچھتے ہوئے ڈر لگا کہ وہ دروازہ کون تھے۔ چنانچہ ہم نے مسروق سے کہا (کہ وہ پوچھیں) جب انہوں نے پوچھا کہ وہ دروازہ کون تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ دروازہ عمرؓ تھے۔ (صحیح بخاری کتاب الفتن باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر حدیث: 7096)

اس حدیث کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار کہلاتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ ہونے والے کئی واقعات کے حوالے سے خاص طور پر انہیں بتایا ہوا تھا۔ ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاص فتنہ کے متعلق دریافت فرمایا۔ اس کا مطلب آپ رضی اللہ عنہ کو بھی اس فتنہ کے بارے میں کسی حد تک علم تھا۔ پھر روایت سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے دور خلافت میں ہونے

والے واقعات کے حوالے سے علم تھا اس لیے آپ نے فتنوں کے متعلق زیادہ تفصیل نہیں پوچھی بلکہ دروازے کے متعلق پوچھا۔ اور دروازہ توڑے جانے کے الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہو گی۔ اور اسی طرح ہوا۔

سنن ابو داؤد میں ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مؤذن اقرع بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت عمرؓ نے ایک پادری کے پاس اسے بلانے کے لیے بھیجا، میں اسے بلا لایا، تو حضرت عمرؓ نے اس سے کہا: کیا تم کتاب میں مجھے (میرا حال) پاتے ہو؟ وہ بولا: ہاں، انہوں نے کہا: کیسا پاتے ہو؟ وہ بولا: میں آپ کو قرن پاتا ہوں، تو انہوں نے اس پر درہ اٹھایا اور کہا: قرن کیا ہے؟ وہ بولا: لوہے کی طرح مضبوط اور سخت امانت دار، انہوں نے کہا: جو میرے بعد آئے گا تم اسے کیسے پاتے ہو؟ وہ بولا: میں اسے نیک خلیفہ پاتا ہوں، سوائے اس کے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دے گا، حضرت عمرؓ نے کہا: اللہ عثمان پر رحم کرے، (تین مرتبہ) پھر کہا: ان کے بعد والے کو تم کیسے پاتے ہو؟ وہ بولا: وہ تو لوہے کا میل ہے (یعنی برابر تلوار سے کام لینے کی وجہ سے ان کا بدن اور ہاتھ گویا دونوں ہی زنگ آلود ہو جائیں گے) حضرت عمرؓ نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، اور فرمایا: اے... (تو یہ کیا کہتا ہے) اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! وہ ایک نیک خلیفہ ہو گا لیکن جب وہ خلیفہ بنایا جائے گا تو حال یہ ہو گا کہ تلوار بے نیام ہو گی، خون بہہ رہا ہو گا، (یعنی اس کی خلافت فتنہ کے وقت ہو گی)

اس روایت میں اس پادری کے حوالے سے بیان کردہ امور اسی طرح ظاہر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کا نام یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بتا بھی دیا اور اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بعینہٖ اسی طرح معاملہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کیا حالات ہونے تھے؟ اس کی پیشگوئی اس روایت میں بیان ہوئی۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ہم بیٹھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتظار کر رہے تھے، اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ایک بیوی کے گھر سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے، ہم بھی آپؐ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، آپؐ کا جوتا ٹوٹ گیا، حضرت علیؓ اس کی مرمت کے لئے پیچھے رک گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلتے رہے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چلتے رہے، پھر آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتظار میں کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے بعض لوگ اس قرآن مجید کی تاویل و تفسیر کے مطابق لڑیں گے، جیسے میں لڑا ہوں۔ ہم نے گردنیں اٹھا کر دیکھا کیونکہ ہمارے اندر سیدنا ابو بکرؓ اور سیدنا عمرؓ بھی موجود تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں،

بلکہ یہ آدمی تو جوتا مرمت کرنے والا ہے۔ پس ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خوشخبری سنانے کے لیے ان کے پاس گئے، تو گویا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ پہلے ہی سنے ہوئے تھے (اس لیے خوشی کا اظہار نہیں کیا)۔

(مسند الامام احمد بن حنبل، مسند المکثرین، مسند ابو سعید خدریؓ حدیث 11712، جلد 8 دار الحدیث قاہرہ 2012ء)

اس روایت میں رسول کریم ﷺ نے اپنی اور حضرت علیؓ کے دور میں ہونے والی لڑائیوں میں مشابہت بیان فرمائی اور حضرت علیؓ کو پہلے سے خبر دے کر ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے رسول کریمؐ کو آئندہ آنے والے ہر خلیفہ کے متعلق بلکہ ان کے ادوار میں ہونے والے واقعات کا علم بھی دے دیا گیا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ہونے والے واقعات کا اشارہ پیشگوئی کی صورت میں اس طرح دیا۔ مسند احمد میں ایک روایت ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ کہتی ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! کاش ہمارے پاس کوئی ایسا آدمی ہوتا جو ہمارے ساتھ باتیں کرتا۔ میں نے کہا: اللہ کے رسول! کیا میں ابو بکرؓ کو پیغام بھیج دوں؟ آپ ﷺ خاموش رہے، کچھ دیر بعد آپ ﷺ نے پھر فرمایا: کاش ہمارے پاس کوئی آدمی ہوتا جو ہمارے ساتھ باتیں کرتا۔ میں نے کہا: کیا میں عمرؓ کو پیغام بھیج دوں؟ لیکن آپؐ اس بار بھی خاموش رہے، کچھ دیر بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خادم کو بلوایا اور رازدارنہ انداز میں اس کے ساتھ کوئی بات کی، وہ چلا گیا، تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ سیدنا عثمانؓ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے انہیں اجازت دی اور وہ اندر تشریف لے آئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافی دیر تک ان کے ساتھ سرگوشی کرتے رہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: عثمان! اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا، اگر منافقین اس قمیص کو اتارنے کا مطالبہ کریں تو ان کے کہنے پر تم اسے نہ اتارنا، کیونکہ اس کے اتارنے میں کوئی عزت نہیں رہے گی۔ آپ ﷺ نے یہ بات دو تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔

(مسند الامام احمد بن حنبل، مسند النساء، مسند عائشۃ بنت صدیقؓ حدیث 24342، جلد 13 دار الحدیث قاہرہ 2012ء)

یہی قمیص نہ اتارنے والی روایت ان کتب میں بھی ہے۔ (1) سنن ابن ماجہ، افتتاح الکتاب فی الایمان وفضائل الصحابۃ والعلم باب فضل عثمانؓ حدیث 112 (2) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب المناقب باب مناقب عثمانؓ، الفصل الثانی حدیث 6077

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بعینہٖ اسی طرح واقعہ ہوا کہ آپؓ سے خلافت کی قمیص اتارنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن آپؓ نے رسول کریم ﷺ کی نصیحت کے مطابق اسے نہیں اتارا۔ واضح ہے کہ رسول کریم ﷺ کو ان حالات کی آگاہی تھی اور آپ ﷺ نے کسی حد تک حضرت عثمانؓ کو بھی اس سے آگاہ فرما دیا تھا۔

اب خلافت علی منہاج النبوت کے متعلق پیشگوئیوں اور ان پیشگوئیوں کے مطابق وقوع پذیر حالات کو پڑھنے کے بعد دوبارہ اس مضمون کی ابتدائی سطور میں انتخاب خلافت کے حالات پڑھیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگرچہ انتخاب کے وقت مومنین کی رائے شامل تھی اور انہوں نے اپنی مرضی سے رائے دی تھی۔ امر خلافت کے متعلق بحث بھی ہوئی، اختلاف بھی ہوا، دلائل کا تبادلہ بھی ہوا لیکن ہوا وہی جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ خلافت علی منہاج النبوت کے لیے انتخاب پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ پہلے ہی اپنے پیارے نبی ﷺ کو تمام تر حالات سے آگاہ فرما چکا تھا۔

اب یہ بات سمجھنا بہت آسان ہے کہ بے شک انتخاب خلافت ایمان اور عمل صالح کرنے والے ہی کرتے ہیں، وہ رائے بھی دیتے ہیں، اپنے خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں اور اس حوالے سے انہیں مکمل آزادی ہوتی لیکن اس کے پیچھے الٰہی تقدیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ مومن بندوں کا انتخاب اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے موافقت اختیار کر لیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں پر اس انتخاب کے حوالے سے اطمینان نازل کرتا ہے۔ ہاں جو دل ایمان اور عمل صالح سے خالی ہوتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان کا نزول لازم نہیں۔

رسول کریم ﷺ کی پیشگوئیوں کے مطابق پہلی خلافت علی منہاج النبوت کا تیس سالہ دور تقریباً چالیس ہجری میں ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد پیشگوئی کے عین مطابق بادشاہت اور ملوکیت کا دور بھی آیا اور گزر گیا۔ اب اس پیشگوئی کے مطابق دوبارہ خلافت علی منہاج النبوت کا دور شروع ہو کر جاری وساری ہے۔ اسی خلافت کے زیر سایہ اسلام کا حقیقی پیغام پوری دنیا میں پھیلایا جا رہا ہے۔ پیشگوئی کے مطابق اس خلافت کا دور قیامت تک ہے۔ اس دور خلافت کے حوالے سے بھی بے شمار پیشگوئیاں ہیں ان میں سے کچھ پوری ہو چکی ہے اور جو پوری ہو چکی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں اور جو پیشگوئیاں ابھی پوری نہیں ہوئیں وہ بھی پوری ہو جائیں گی۔ (انشاء اللہ) اس وقت اس خلافت علی منہاج النبوت کا پانچواں دور چل رہا ہے۔

پیشگوئیوں کے مطابق ظہور پذیر واقعات اسلام اور آنحضرت ﷺ کی صداقت کی پختہ دلیل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت مسیح موعودؑ اور آپؑ کے بعد جاری سلسلہ خلافت علی منہاج النبوت کی سچائی کے گواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان اور عمل صالح پر قائم رکھے تا مطمئن دلوں کے ساتھ رسول کریم ﷺ کے پیشگوئی کے مطابق جاری وساری خلافت علی منہاج النبوت سے وابستہ رہیں اور یہ وابستگی قیامت والے دن ہماری نجات کا موجب ہو۔ آمین

❁❁❁❁❁

قرآن، بائبل اور تاریخ

وَهُمْ أُلُوفٌ کہہ کر قرآنِ مجید نے بائبل کی غلطی کی اصلاح کی

خروج مصر کے وقت بنی اسرائیل کی تعداد بقول بائبل لاکھوں تھی یا بقول قرآن ہزاروں تھی؟

(ایم۔ایم گلفام)

جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو فرعون کے چنگل سے چھڑا کر ملکِ مصر سے نکلے تو اس موقع پر بائبل بنی اسرائیل کی تعداد لاکھوں میں بتاتی ہے۔ جبکہ قرآنِ مجید میں ان کی تعداد چند ہزار بیان ہوئی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اسی حوالہ سے تاریخی اور جغرافیائی حوالوں سے بحث کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی تعداد بیان کرنے میں بائبل کے لکھنے والوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے جبکہ قرآنِ مجید نے ان کی اصل تعداد بیان کر کے بائبل کی اس غلطی کی اصلاح کی ہے۔

خروج از مصر کے وقت بنی اسرائیل کی تعداد کے حوالہ سے بائبل کا موقف:

بنی اسرائیل کی چوتھی پشت نے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں مصر سے موعودہ زمین کی طرف ہجرت کی۔ بائبل اس موقع پر بنی اسرائیل کے صرف مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زائد بتاتی ہے۔(خروج باب 12 آیت 37) جو ناقابل یقین ہے۔ یہ تعداد چار پشتوں میں اتنی کیسے ہوئی اس بارے تمام محققین حیران ہیں۔ اس تعداد کی تعیین ہجرت کے واقعات میں دو دفعہ مردم شماری کی صورت میں ہوئی۔ پہلی دفعہ مردم شماری مصر سے ہجرت کرنے کے دو سال بعد دشتِ سینا میں ہوئی

جس میں بیس سال سے اوپر کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ پچیس ہزار پانچ سو پچاس (625550) تھی۔ (گنتی باب 1 تا 3) جبکہ دوسری دفعہ مردم شماری 38 سال بعد موآب کے پہاڑوں میں کی گئی جس میں بیس سال سے اوپر کی عمر کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ چوبیس ہزار سات سو تیس (624730) تھی۔ (گنتی باب 26)

الغرض بائبل کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بنی اسرائیل مرد وزن اور بچے شامل کر کے تقریباً 30 سے 40 لاکھ کی تعداد میں تھے۔ جیسا کہ James Hoffmeier لکھتا ہے:

> "If there were actually 600,000 fighting men, to which women, children, older men, and the Levite tribe (which are reckoned separately in Numbers 3−4) should be added, a total of 3−4 million is likely."[1]

مفہوماً ترجمہ: اگر چھ لاکھ جنگی مرد تھے تو ان میں عورتیں، بچے، بوڑھے اور لاوی قبیلہ (جو گنتی 3،4 میں علیحدہ شمار کئے گئے ہیں۔) شامل کرنے چاہئیں، جس سے غالباً تین سے چار ملین تعداد بنے گی۔

قرآن کریم کا دعویٰ:

اس کے برعکس قرآن کریم یہ دعویٰ کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ (البقرۃ: 244)

ترجمہ: کیا تجھے ان لوگوں کی اطلاع نہیں جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

یعنی تعداد کے لحاظ سے وہ چند ہزار تھے۔ تعداد کے حوالہ سے قرآن کریم فرعون کا ایک قول بھی نقل کرتا ہے جس سے بنی اسرائیل کی عددی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل جب رات کو مصر سے نکلے تو فرعون نے غصہ میں آکر کہا: اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ۔ (الشعراء: 55) **ترجمہ:** یقیناً یہ لوگ ایک کم تعداد حقیر جماعت ہیں۔

یعنی بنی اسرائیل کی مصریوں کے مقابل ایک چھوٹی حقیر سی تعداد تھی۔ نہ کہ تین، چار ملین کا ایک جم غفیر۔

قرآن و بائبل کے دعووں پر عقلی و نقلی تجزیہ:

مذکورہ بالا دعووں کو مد نظر رکھتے ہوئے جب عقلی و نقلی لحاظ سے تحقیق کی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن

---

[1]James Hoffmeier, *The Ancient Israel in Sinai*: Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition.:,.(Oxford University Press.2005) p:153

کریم کا بیان ہی درست ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل پچھتر 75 کی تعداد میں مصر گئے ان کا وہاں قیام چار پشتیں تک رہا اور چوتھی پشت میں واپس کنعان لوٹ آئے۔ پچھتر 75 افراد (12 مرد سربراہوں) کا چار پشتوں میں تین، چار ملین ہو جانا نہ صرف بعید از عقل ہے بلکہ قانونِ پیدائش کے بھی منافی معلوم ہوتا ہے۔ ماہرین علم الانساب (Genealogists) کے نزدیک:

The average number of children born to the descendants of Yaacov is three to five.[1]

مفہوماً ترجمہ: حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں افزائش کا تناسب اوسطاً تین سے پانچ بچے ہیں۔

مذکورہ بالا تناسب میں اگر بنی اسرائیل کے بارہ مردوں کی اوسطاً پانچ کی شرح کو بھی مدنظر رکھا جائے تو چار پشتوں تک ان کی تعداد 7500 سو بنتی ہے۔ الغرض بائبل کے اس مبالغہ آمیز اور غلط حقائق پر مشتمل بیان پر عیسائی مفسرین بھی یہ اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

This, according to the data given elsewhere represents the increase in the third generation, of the twelve sons of Jacob who settled in Egypt and is beyond all belief. It is, of course, possible and even probable that the numbers of Hebrew immigrants into Egypt were in excess of what is recorded; but the number of those that accompanied Moses into the wilderness at Exodus cannot possibly have amounted to the sum here mentioned.[2]

مفہوماً ترجمہ: یہ مواد جہاں کہیں بھی دیا گیا ہے اس کی رو سے حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کا جو مصر میں مقیم ہو گئے تھے تیسری نسل میں اس حد تک بڑھ جانا ناقابل یقین ہے۔ اس امر کا امکان ہے، بلکہ غالب امکان ہے کہ عبرانی مہاجرین جو مصر گئے اس تعداد سے زیادہ تھے جو ادھر بتائی گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد جو صحرا میں خروج کے وقت موسیٰؑ کے ساتھ رہے اس جگہ مذکورہ تعداد کے مطابق ہونا ممکن نہیں۔

حضرت خلیفہ المسیح الثانیؓ فرماتے ہیں:

"ایک اور دلیل سے بھی یہ امر خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تو درکنار چند لاکھ بھی ہوں اور وہ اس طرح کہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے لے کر حضرت یعقوبؑ کے مصر میں داخل ہونے تک قریباً دو سو سال کا

[1] http://www.ancient-hebrew.org/39_exodus.html

[2] Peake M.A, D.D, *A Commentary of the Bible* (Thomas Nelson and sons LTD. Printed in 1919) p:214

عرصہ بائبل کے بیان کے مطابق گذرا ہے اس عرصہ میں حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے افراد 12 تک پہنچتے ہیں عیسو کی اولاد کو بھی اگر اس قدر فرض کر لیا جائے تو دوسو سال میں چوبیس افراد تک ان کی نسل پہنچتی ہے اس کے بعد مصر سے نکلنے کے زمانہ تک دوسو سال گذرے ہیں پس عام اندازہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کی نسل اس دوسو سال میں چھ سات سو افراد تک پہنچ گئی ہو گی لیکن اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ وہ بہت شادیاں کرتے تھے اور اولاد زیادہ ہوتی تھی تب بھی پندرہ بیس ہزار سے زائد تو کسی صورت میں بھی ان کی تعداد نہیں ہو سکتی اور اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ بنی اسرائیل اپنے سفر کے دوران میں معمولی شہر کے آدمیوں سے بھی ڈرتے تھے اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دواڑھائی ہزار سپاہیوں سے زیادہ نہیں تھے۔"

(تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مصلح موعودؓ جلد 7 صفحہ 541، 542 مطبوعہ اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز یو۔کے 2023ء)

ماہرین آثارِ قدیمہ، مؤرخین اور جدید علوم کے ماہرین کی آراء:

جدید علوم کے ماہرین کی تحقیقات کی کچھ جھلکیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

مشہور عیسائی پروفیسر، ماہر آثارِ قدیمہ اور محقق James Hoffmeier لکھتا ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے کنعان اور اسرائیل کی مختلف ادوار میں آبادی کے بارے میں بہت زیادہ تحقیقات ہوئیں۔ جس کے لئے ماہرین آثارِ قدیمہ نے کئی سال ان علاقوں کے سروے کئے۔ ان کے مطابق Middle bronze age(2000 ق م سے 1500 ق م) میں پورے کنعان کی آبادی 140،000 کے لگ بھگ تھی۔ نیز نہ تو آثارِ قدیمہ اور نہ کوئی تاریخی ثبوت اتنے بڑے گروہ کا کنعان میں داخل ہونے کا بتاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق Ramesside Period (مصر پر حکومت کرنے والے 19 اور 20 ویں خاندان) (19th&20th dynasties) کا دور Ramesside Period کہلاتا ہے۔ ان خاندانوں کا عرصہ اقتدار 1307 ق م سے 1070 ق م بنتا ہے۔ اس دور کو یہ نام دیئے جانے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس دور میں 11 فرعون ایسے گزرے ہیں جن کے نام کے ساتھ رعمسیس کا لفظ آتا تھا) میں پورے مصر کی آبادی 30 سے 35 لاکھ سے زائد نہ تھی۔[1] الغرض زمینی حقائق بھی بائبل کے بیان کے منافی ہیں۔

ازروئے قرآن، فرعون کے قول کے مطابق بنی اسرائیل لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ۔ (الشعراء: 55) تھے جس سے

---

[1] James Hoffmeier, *The Ancient Israel in Sinai*: Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition. (Oxford University Press.2005) pp:154-155

ظاہر ہوتا ہے کہ بہر حال وہ مصریوں کے مقابل پر بہت ہی تھوڑے تھے۔ مذکورہ بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 30 سے 35 لاکھ تو اس وقت پورے مصر کی آبادی تھی تو بنی اسرائیل اتنی بڑی تعداد میں کیسے ہو سکتے تھے۔

پھر فرعون نے جب بنی اسرائیل کا پیچھا کرنا چاہا تو بائبل کے مطابق فرعون نے اپنے چھ سو چنے ہوئے بلکہ مصر کے سب رتھ لئے اور اپنے سب سرداروں کو اس پر بٹھایا اور اسرائیلیوں کا پیچھا کیا۔(خروج باب 14 آیت 5 تا 7) تیس، چالیس لاکھ لوگوں (چھ لاکھ مردوں) سے لڑنے اور ان کو پکڑنے کے لئے فرعون چھ سو رتھیں لے کر جا رہا ہے۔ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ۔ مصری ہوئے نہ کہ اسرائیلی۔ عقلاً بھی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ چھ سو رتھیں چھ لاکھ مردوں سے لڑنے کے لئے آئی ہوں۔ مصر میں اس وقت مستعمل ہونے والی رتھوں کے نمونے دریافت ہو چکے ہیں اس کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک رتھ پر دو سے تین افراد بیٹھ سکتے ہیں۔[1] اگر ایک رتھ پر تین افراد بھی بیٹھیں تو 600 رتھوں پر 1800 لوگ آئیں گے جو کسی لحاظ سے چھ لاکھ مردوں سے جنگ لڑنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ مصریوں نے بنی اسرائیل کو کیا پکڑنا تھا سب بنی اسرائیل اگر ان سے لڑتے تو آسانی سے ان کو کچل سکتے تھے۔ جب کہ قرآن و بائبل دونوں کا بیان ہے کہ وہ مصریوں سے جنگ کرنے سے ڈر رہے تھے۔

رعمسیس ثانی کے دور میں استعمال ہونے والی رتھ کا خاکہ

مزید یہ کہ فرعون چھ سو سے زیادہ رتھیں بھی بھیج سکتا تھا مگر اس کا 600 رتھوں کو لے کر آنا یہ بات ثابت کرتا ہے کہ وہ اسرائیلیوں کو پکڑنے کے لئے یہ تعداد کافی سمجھ رہا تھا۔ اگر بنی اسرائیل تیس لاکھ میں ہوتے تو وہ کبھی بھی اتنی رتھیں نہ لے کر آتا۔ ہاں اگر یہ تعداد چند ہزار مانی جائے تو بائبل کا بیان عقلاً درست معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً دو ہزار مسلح

[1] T.G.H. James , *Ramesses the Great*, The American University in Cairo press. pp:98,103,104,105

مصری فوج بنی اسرائیل جیسی ماتحت قوم کو زیر کرنے کے لئے آئی ہو۔

اس دلیل پر کوئی یہ امکان بھی پیش کر سکتا ہے کہ رتھوں کے علاوہ پیادہ فوج بھی آئی ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ ایسا ہونا عقلاً صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ بنی اسرائیل رات کو مصر سے نکلتے ہیں فرعون کو علم ہونے پر وہ اپنے نمائندوں کو مختلف شہروں میں اپنی فوج کو اکٹھا کرنے کے لئے دوڑاتا ہے۔ فوج اکٹھی ہونے پر صبح کے وقت ان کا پیچھا کرتا ہے تو ان کے درمیان کئی گھنٹوں کی مسافت کا فرق تھا جو رتھیں تو کم کر سکتی تھیں پیادہ فوج اس کی حامل نہ ہو سکتی تھی۔

حال ہی میں جرمن ماہرین آثارِ قدیمہ نے Qantir شہر (بائبل کا بیان کردہ رعمسیس شہر جہاں سے بنی اسرائیل نکلے تھے) کی کھدائی کی جس میں انہیں اصطبلوں کے آثار ملے ہیں ان میں 460 تک گھوڑوں کی گنجائش تھی۔ لہٰذا فرعون کا 600 رتھیں لانا کوئی مبالغہ نہیں لگتا۔ پھر ڈیلٹا کے علاقہ میں کھدائیوں کے بعد ماہرین آثارِ قدیمہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں غیر ملکی لوگوں کی رہائش کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی ڈیلٹا کی زمین اتنی بڑے گروہ کی ضروریات کی متحمل ہو سکتی تھی۔[1]

حضرت خلیفہ المسیح الثانیؓ بیان فرماتے ہیں:

”بائبل بیان کرتی ہے کہ جب بنی اسرائیل نے مصر سے ہجرت کی تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے (خروج باب 12 آیت 38) مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ وَهُمْ أُلُوْفٌ (البقرۃ:244) وہ صرف ہزاروں تھے اور تاریخ سے اور بائبل کی تفصیلات سے بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ ہزاروں ہی ہو سکتے تھے لاکھوں نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ لاکھوں آدمی اتنی جلدی مصر کے دور دراز علاقہ سے بحیرۂ قلزم تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ نہ لاکھوں آدمیوں کے لئے سواریاں میسر آ سکتی تھی۔ آج کل مشینوں کا زمانہ ہے۔ لیکن پھر بھی اگر تیس چالیس ہزار آدمی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہیں تو ریلیں اور لاریاں ان کے لے جانے سے عاجز ہو جاتی ہیں کجا یہ کہ گھوڑوں، بیلوں اور گدھوں کا زمانہ ہو اور ایک رات میں لاکھوں آدمی کئی سو میل پر پہنچا دیئے جائیں۔“

(تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مصلح موعودؓ جلد 10 صفحہ 155 مطبوعہ اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز یو۔کے 2023ء)

عیسائی محققین نے بہت حد تک اس موضوع پر بحثیں کی ہوئی ہیں ان کی تحقیقات بھی اسی نتیجہ پر منتج ہوتی ہیں جسے

[1]James Hoffmeier, *The Ancient Israel in Sinai*: Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition. Oxford University Press.2005. p:154

قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔

گنتی باب 1 اور باب 26 میں بنی اسرائیل کی مردم شماریوں کا ذکر ہے۔ ان مردم شماریوں کے مطابق بنی اسرائیل کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے اوپر ہے۔ ان ابواب میں بیان کردہ تعداد پر تحقیق کے حوالے سے George Mendenhall[1] اور William Mathew Flinders Petrie[2] کے نام سامنے آتے ہیں۔

ان کا یہ نظریہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو قبیلوں اور آبائی خاندانوں کے مطابق گنتی کرنے کا حکم دیا تھا۔ (گنتی باب 1 آیت 2) لہٰذا جب گنتی درج کی گئی تو ہر قبیلہ کی تعداد یوں درج کی گئی کہ:

"روبن کے قبیلہ کے جو آدمی شمار کئے گئے وہ چھیالیس ہزار پانچ سو تھے۔" (گنتی باب 1 آیت 21)

چونکہ حضرت موسیٰؑ کو قبیلوں اور خاندانوں کے مطابق گنتی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جسے مترجمین نے درج کرنے میں غلطی کھائی۔ انہوں نے جس لفظ کا ترجمہ ہزار کیا عبرانی میں وہ لفظ אֶלֶף (اَلِف) ہے۔ اس لفظ کے کئی مطلب ہیں

---

[1] 13 فروری 1916ء کو امریکہ میں پیدا ہوا۔ 1936ء میں Midland College اور 1938ء میں Lutheran Theological Seminary at Gettysburg سے گریجوایشن کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس نے Johns Hopkins University سے سامی زبانوں کی تعلیم حاصل کی اور 1952ء سے 1986ء تک University of Michigan U.S میں مشرقِ قریب کے علوم پڑھاتے رہے۔ http://en.wikipedia.org/wiki/George_E._Mendenhall

[2] یہ ایک مشہور برطانوی ماہرِ مصریات ہے۔ اس کی پیدائش 3 جون 1853ء کو چیرلٹن لندن میں ہوئی۔ ابتداء سے ہی آرکیالوجی میں دلچسپی تھی آٹھ سال کی عمر میں ہی یونانی، لاطینی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم دی گئی۔ مصریات کے میدان میں 1880ء میں قدم رکھا اور ابتداءً غزہ کے اہراموں سے کی۔ اس کے بعد اس نے ٹینس (Tanis) کے مندروں کے قریب بھی کھدائیاں کیں۔ 1885ء سے 1890ء تک مختلف جگہوں کی کھدائی کی۔ 1886ء تک اس نے E.E.F یعنی (Egypt Exploration Fund) کے ساتھ کام کیا اس کے بعد 1887ء سے 1892ء تک اکیلے کام کیا لیکن 1896 تا 1905ء دوبارہ E.E.F کے ساتھ مل گیا۔ 1894ء میں اس نے ایک تنظیم "Egyptian Research Account" کی بنیاد رکھی جو 1904ء میں British School of Archaeology کے طور پر کام کرنے لگی۔ 1896ء میں اس نے اپنی ایک ٹیم کے ہمراہ Luxor مقام پر بے شمار کھدائیاں کیں اور مشہور منفتاح سٹیلے (Merneptah Stele) دریافت کیا۔ اس نے 50 سے زائد جگہوں پر کھدائیاں کیں اور سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ اسے ڈاکٹریٹ کی پانچ اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔ اس کی وفات 28 جولائی 1942ء کو یروشلم میں ہوئی۔

(a)*Encyclopedia Britannica*,v.17, (1951)p:661 & (b) Charlotte Booth, *The Ancient Egyptians for dummies*, John Willey and Sons ltd Chichester West Sussex England (2007), p:330

مثلاً(1)ہزار،(2) خاندان، نگران، سربراہ۔[1] لہٰذا موئخر الذکر ترجمہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس عبارت کا ترجمہ یوں بنے گا:”روبن کے قبیلہ کے جو آدمی شمار کئے گئے وہ(46) چھیالیس خاندانوں(سرداروں) کے پانچ سو تھے“یعنی روبن کے قبیلہ کے چھیالیس خاندانوں کے(جن کے چھیالیس نگران بنیں گے) بیس سال سے اوپر کے افراد کی تعداد پانچ سو ہے۔

اگر اسی ترجمہ کو مد نظر رکھتے ہوئے گنتی باب 1 میں کی گئی مردم شماری میں سارے قبیلوں کے مکمل خاندانوں(یاسربراہوں)کی تعداد جمع کی جائے تو ٹوٹل تعداد 598 بنے گی اور ان کے بیس سال سے زائدافراد کی تعداد5550بنے گی۔(اس جگہ Mendenhall کا Petrie سے اختلاف ہے۔Mendenhall اس تعداد کو صرف جنگی مردوں کی تعداد تصور کرتا ہے جبکہ Petrie کے مطابق یہ بنی اسرائیل کی ٹوٹل تعداد ہے۔[2]

جو کہ ممکنہ طور پر بنی اسرائیل کے مردوں کی تعداد ہو سکتی ہے۔[3]،[4] یہ بعینہٖ وہ تعداد نکلتی ہے جو قرآن کریم کے بیان وَهُمْ أُلُوفٌ (البقرۃ:244)کی مؤید ہے۔

بائبل کی اندرونی شہادتیں:

اس کے علاوہ بائبل کی اندرونی شہادت سے بھی ہمیں کئی جگہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بائبل نے تعداد بیان کرنے میں غلطی کھائی ہے۔ منجملہ ان دلائل کے جو بائبل سے ملتے ہیں ایک یہ ہے کہ گنتی باب3 آیت40 تا43 میں ذکر آتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو خدا نے بنی اسرائیل کے سب نرینہ پہلوٹھوں کی(جو ایک مہینہ یا اس سے اوپر کے ہیں) گنتی کرنے کو کہا۔لہٰذا گنتی کرنے پر ان کی تعداد بائیس ہزار دو سو تہتر(22273) نکلی۔

---

[1]Ernest Klein, *A Comprehensive Etymological Dictionary of the Hebrew Language for readers of English*,: Macmillan Publishing Co., N.Y.1987.

[2] اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم David Ben-Gurion جو کہ اپنی ذات میں ایک بہت ہی علمی و تحقیقی اور مذہبی شخصیت کے مالک تھے۔ نیز بائبل کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے انہوں نے بھی غالباً اسی بات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا کہ حضرت موسیٰؑ نے جب مصر سے ہجرت کی تو ان کے ساتھ صرف 600 بنی اسرائیلی تھے۔

(https://www.nytimes.com/1973/12/02/archives/bengurion-symbol-of-the-tough-state-of-israel-achieved-a-lifelong.html)

[3] Alfred Hoerth, *Archaeology and The Old Testament*, Published by: Baker Book House, Michigan, 1999. pp:177-178

[4] George E. Mendenhall, *The Census Lists of Numbers 1 and 26*. Journal of Biblical Literature. Vol. 77, No. 1 (Mar., 1958), pp: 52-66

اس تعداد سے پتہ چلتا ہے کہ کل22273گھرانے تھے۔ان پہلوٹھوں کی تعداد کو کم سے کم بیس لاکھ تعداد پر بھی تقسیم کریں تو نتیجہ کچھ یوں ہوگا کہ ہر فیملی کے90بچے بنیں گے جن میں سے ایک پہلوٹھا اور89اس کے بہن بھائی۔

اگر محتاط اندازے کے مطابق اتنی ہی تعداد پہلوٹھی لڑکیوں کی مان لی جائے تو یہ تعداد چوالیس ہزار پانچ سوچھیالیس(44546)بنے گی۔لہٰذا بنی اسرائیل کی کم سے کم تعداد بیس لاکھ کے حساب سے بھی دیکھا جائے تو ہر فیملی کے 45بچے بنیں گے جن میں سے ایک پہلوٹھا اور44اس کے بہن بھائی۔[1]تو یہ نتیجہ ہر صاحب عقل کے لئے ناقابلِ قبول ہوگا۔

مذکورہ بالا نتیجہ سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ گنتی باب3آیت26میں لاوی قبیلہ کے نرینہ پہلوٹھوں کی بھی گنتی کی گئی تھی جن کی تعداد بائیس ہزار تھی جو کہ باقی گیارہ قبیلوں کے نرینہ پہلوٹھوں سے صرف273زیادہ تھے۔یہ امر لازماً ایک محقق کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ گیارہ کے مقابلہ پر ایک قبیلہ نسلاً کیسے اتنی ترقی کر سکتا ہے۔

مجملہ ان دلائل کے جو بائبل کے اپنے مؤقف کی تردید کرتے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ رفیدیم میں حضرت موسیٰؑ کے خسر یترو آپؑ کو ملے۔انہوں نے آپؑ کی مصروفیت کے باعث آپؑ کو یہ مشورہ دیا کہ بنی اسرائیل کے لوگوں میں سے ہی کچھ سمجھدار افراد کو چن کر انہیں ہزاروں پھر سینکڑوں،پچاسیوں پھر دسیوں افراد پر قاضی مقرر کر دیں جو ان کے معاملات سن کر فیصلہ کیا کریں۔(خروج باب 18 آیت 21)اس آیت میں بڑے سے بڑا عدد جو درج کیا گیا ہے وہ ہزار ہے۔اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل ہزاروں میں تھے نہ کہ لاکھوں میں کیونکہ اگر لاکھوں میں ہوتے تو لاکھ پر بھی کوئی نگران مقرر کرنے کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔

اس سے آگے بڑھتے ہوئے خروج باب1آیت15سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون کی طرف سے صرف دو دائیوں کو نومولود عبرانی بچوں کو مارنے کے لئے کہا گیا تھا۔تیس،چالیس لاکھ کے جم غفیر میں صرف دو دائیوں کو اس طرح کے کام پر مامور کرنا بتاتا ہے کہ یا تو اسرائیلی کی تعداد بیان کرنے میں غلطی لگی ہے یا دائیوں کی تعداد میں۔جو بھی مؤقف سامنے آئے وہ بہر حال بائبل کی وقعت کو زد پہنچائے بغیر نہیں رہے گا۔

پھر مجملہ ان دلائل کے جو بائبل کے اپنے مؤقف کو رد کرتے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ چھ لاکھ مردوں کا چھوٹے چھوٹے کنعانی قبائل کو مغلوب کرنے سے عاجز آنا(جیسا کہ قضاۃ باب5آیت35،27،19)اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ یہ

[1]. Peake M.A, D.D., *A Commentary of the Bible*, Thomas Nelson and sons LTD. Printed in 1919 p:215

تعداد میں ہزاروں تھے نہ کہ چھ لاکھ۔اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئےHoffmeierلکھتا ہے کہ

"The size of armies elsewhere in the ancient Near East indicates that fighting forces of the time are minuscule when compared to 600,000."[1]

مفہوماًترجمہ: قدیم مشرق قریب میں ہر جگہ فوج کی تعداد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی جنگی قوتیں چھ لاکھ کی نسبت بہت ہی کم تھیں۔

نیز محققین کو اس بات نے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ گنتی باب1اور26کے علاوہ اور کوئی مقام ایسا نہیں جہاں بنی اسرائیل کی اتنی زیادہ تعداد درج کی گئی ہو۔اس سے آگے بڑھتے ہوئے بائبل میں مختلف مقامات پر(مثلاً قضاۃ باب5آیت8میں) ہجرتِ کنعان کے کئی برسوں بعد جنگجوؤں کی تعداد کا چالیس ہزار بیان ہونا ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ بنی اسرائیلی جنگجو کم ہو رہے تھے یا زیادہ۔

الغرض ان دلائل کے بعد جب محققین کے پاس اتنی بڑی تعداد ماننے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

"The total of 603,550 here given must be fiction".[2]

مفہوماًترجمہ: ادھر(گنتی باب1آیت46۔ناقل)درج کی گئی مکمل تعداد603550لازماًتصوراتی ہے۔

دوسرا مفسر بائبل یہ بیان دے کر اپنی جان چھڑاتا ہے کہ:

"This figure does not have a numerical but a symbolic value. It shows God's exceptional protection under which the Israelites prospered and flourished notwithstanding the Egyptian oppression".[3]

مفہوماًترجمہ: اس عدد کی شمار کے لحاظ سے نہیں بلکہ علامتی لحاظ سے اہمیت ہے۔جس سے خدا کی اس خاص حفاظت کا اظہار کیا گیا جس کے تحت مصریوں کے ظلم کے باوجود اسرائیلی پلے بڑھے۔

---

[1] James Hoffmeier, *The Ancient Israel in Sinai*: Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition. Oxford University Press.2005 p:154

[2] Peake M.A, D.D., *A Commentary of the Bible*, Thomas Nelson and sons LTD. Printed in 1919 p:214

[3] Rev. Reginald C. Fuller, *A New Catholic Commentary on Holy Scripture*, p:217

مذکورہ بالا دلائل کے بعد اگر بطور تنزل بنی اسرائیل کی تعداد بیس لاکھ مان بھی لی جائے تو بھی مادی حقائق اور ماہرین آثارِ قدیمہ کی جدید علوم کے روشنی میں تحقیق اس تعداد کا انکار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مثلاً کنعان فتح کرنے تک جن جن قبائل سے اسرائیلیوں کو جنگ کرنا پڑی ان میں سے کوئی بھی شہر ایسا نہیں تھا جن کی فوج پانچ ہزار سے زائد ہو۔ لیکن اگر جنگ کے حالات دیکھیں جائیں تو اس سے یوں لگتا ہے کہ بہت سخت مقابلوں کے بعد اسرائیلیوں کو فتح نصیب ہوئی اگر اسرائیلی چھ لاکھ تھے تو اتنی تعداد کے مقابل پر پانچ ہزار تعداد کو چند لمحوں میں شکست دی جاسکتی تھی مگر ادھر تو سخت سے سخت مقابلے ہوئے۔ نتیجتاً ان حالات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہزاروں تھے نہ لاکھوں۔

مثلاً حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں بنی اسرائیل عمالیقیوں سے لڑے اور غروبِ آفتاب تک جنگ جاری رہی تب کافی تگ ودو کے بعد جاکر فیصلہ ہوا۔(خروج باب 17 آیت 8 تا 13) اس حوالہ سے ایک عیسائی محقق لکھتا ہے:

"Today at a rough estimate 5000 to 7000 nomads live with their flocks on the Sinai Peninsula. Israel must therefore have been about 6000 strong since the battle with the Amalekites appears to have been indecisive."[1]

مفہوماً ترجمہ: آج بھی ایک محتاط اندازے کے مطابق سارے جزیرہ نما سیناء کی کل آبادی پانچ سے سات ہزار ہے جو اپنے مال مویشی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس لئے لازماً اسرائیلی چھ ہزار کے قریب تھے جیسا کہ عمالیقیوں کے ساتھ جنگ نتیجہ خیز نہ تھی۔

ماہرین آثارِ قدیمہ کے نزدیک ان کی فوج بھی تین سے پانچ ہزار کے درمیان تھی۔

پھر گنتی باب 13 آیت 28 اور 31 میں درج ہے کہ حضرت موسیٰ نے جن آدمیوں کو کنعان کی جاسوسی کرنے بھیجا تھا انہوں یہ رپورٹ دی کہ جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں اور ان کے شہر بڑے بڑے اور فصیل دار ہیں اور ہم اس لائق نہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔ تو ایک آدمی یہ سوچ کر پریشان ہوتا ہے کہ چھ لاکھ کی فوج کیوں چھوٹے چھوٹے قبائل سے لڑنے کو ڈر رہی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ان شہروں کی کھدائیاں ہو چکی ہیں۔ یریحو وہ پہلا شہر ہے جن کو شکست دے کر فلسطین کی فتح کا آغاز ہوا۔ اس کا کل رقبہ 300x140 میٹر ہے۔ جو کہ سات فٹبال کے گراؤنڈ کے برابر تھا۔ Kathleen Kenyon جو

[1] Werner Keller, *The Bible as the History*, Hamburg 1955 p:136

ایک مشہور Archaeologist ہیں انہوں نے 1952-1956 میں اس شہر کی کھدائی کی ان کا بیان تھا کہ اس شہر کی آبادی تین ہزار سے زائد نہ تھی۔[1]

ماہرین آثارِ قدیمہ کے نزدیک کنعان میں سب سے بڑا شہر "حصور"(Hazor) تھا جو 210 ایکڑ رقبہ پر مشتمل تھا۔اس شہر کی عظمت کا یشوع باب 11 آیت 10 سے بھی پتا چلتا ہے۔لہٰذا ماہرین کے نزدیک Middle bronze age میں اس شہر کی زیادہ سے زیادہ آبادی 33000 سے 42000 معلوم ہوتی ہے۔[2]

اسرائیلیوں کا اتنے چھوٹے چھوٹے قبائل سے لڑنے کو ڈرنا ثابت کرتا ہے کہ بنی اسرائیل اس وقت اپنے آپ کو افرادی قوت کے لحاظ سے کنعانی قبائل سے کم تر سمجھ رہے تھے۔ورنہ تو چھ لاکھ افراد کا جتھہ ان قلعوں کا حصار کر کے ہی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتا تھا۔Hoffmeier مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں نکالتا ہے:

"One can only conclude that the 600,000 has been misunderstood by translators and commentators until more recent times, when other historical records and archaeological data offer a clearer picture about the sizes of armies and the realities of populations in Egypt and the Levant during the second millennium B.C."[3]

مفہوماً ترجمہ: ایک شخص یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ تک مترجمین ومفسرین نے غلطی سے چھ لاکھ تعداد سمجھی ہے جبکہ دیگر تاریخی شواہد وآثارِ قدیمہ دوہزار ق م میں افواج کی مقدار کا مکمل خاکہ اور مصر و مشرقی اقوام کی آبادی کی حقیقت بتاتے ہیں۔

اس کے علاوہ Colin Humphreys جو کہ کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ماہر ریاضی دان (Mathematician) اور بائبل پر عبور رکھتا ہے انہوں نے بائبل میں مذکور بنی اسرائیل کے اعداد شمار کو مد نظر رکھتے ہوئے بنی اسرائیل کی ممکنہ طور پر 20،000 تعداد نکالی ہے۔[4]

---

[1] **(a)** http://www.askelm.com/secrets/sec107.htm
(b) Nigel Stillman & Nigel Tallis.The Armies of the Ancient Near East, 3000 BC-539 BC.

[2] James Hoffmeier,*The Ancient Israel in Sinai*: Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition. Oxford University Press.2005 pp:155-156

[3] James Hoffmeier.*The Ancient Israel in Sinai*: Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition. Oxford University Press.2005 p:156

[4] The Number of People in the Exodus from Egypt: Decoding the Very Large Numbers in Numbers I and XXVI. VetusTestamentum 48: 196–213.

قیام وطعام اور سفر کی مشکلات:

اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ علاقہ جہاں سے بنی اسرائیل گزرے ہیں اس بات کا متحمل تھا کہ اتنے لوگوں کی خوراک اور پانی اور سازگار ماحول مہیا کر سکے۔ پیکس کمنٹری کا مؤلف بیس لاکھ افراد کی رہائش یعنی چھونپڑیوں کو تصور باندھ کر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اگر ایک گز کے فاصلہ پر 50 متوازی لائنیں جھونپڑیوں کے لئے کھینچیں تو یہ 22 میل تک جائیں گی۔[1]

رہائش کے مسئلہ کے بعد ان کی خوراک کے انتظام کی بات آجاتی ہے خوراک کے حوالہ سے ایک Quartermaster (وہ فوجی افسر جس کے ذمہ فوج کے قیام وطعام کی ذمہ داری ہوتی ہے) کے اندازے کے مطابق:

"It would take, 1500 tons of food, 400 tons of wood as fuel and 11000,000 gallons of water each day to supply the basic needs of this group. Another problem is location of the latrine."[2]

مفہوماً ترجمہ: اس گروہ کی بنیادی ضروریات کے لئے ہر دن 1500 ٹن کھانا، 400 ٹن جلانے کے لئے لکڑی اور 1 کروڑ 10 لاکھ گیلن پانی دستیاب ہونا چاہئے تھا۔ قضائے حاجت کے لئے جگہ کا مسئلہ اس کے علاوہ ہے۔

اس حوالہ سے حضرت خلیفہ المسیح الثانیؓ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر ”تفسیر کبیر“ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

”گنتی باب 1 آیت 46 میں ان کی تعداد چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس بتائی گئی ہے۔ اگر مردوں کی تعداد کو ملحوظ رکھ کر عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل تعداد 25 لاکھ کے قریب پہنچ جاتی ہے مگر 215 سال کے عرصہ میں ستر آدمیوں کا 25 لاکھ تک پہنچ جانا بالکل عقل کے خلاف بات ہے اور پھر واقعہ کے بھی خلاف ہے حضرت موسیٰؑ نے جب مصر سے کنعان کی طرف ہجرت کی تو وہ چالیس سال تک جنگلوں میں رہے تو کیا پچیس لاکھ آدمیوں کی روٹی کا انتظام چالیس سال تک ان جنگلوں میں ہو سکتا تھا بے شک بائیبل میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے لئے آسمان سے بٹیر اتارے اور زمین میں ترنجبین پیدا کر دی۔ لیکن بائیبل کے بیان کے مطابق یہ خوراک سارے عرصہ کیلئے مہیا نہیں ہوئی تھی۔ پھر دوسرے عرصہ میں اتنے آدمیوں کے لئے خوراک کہاں سے لاتے تھے۔ پھر بائیبل سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک چشمہ سے پانی بھی پی لیتے تھے۔

---

[1] Peake M.A, D.D., *A commentary of the Bible*, Thomas Nelson and sons LTD. Printed in 1919 p:214

[2] http://www.ancient-hebrew.org/39_exodus.html

اب کیا کوئی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک ایک چشمہ سے پچیس لاکھ آدمی سیر اب ہو سکتا ہے؟ دراصل اس بیان میں سخت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے (مشہور یہودی مؤرخ جوسیفس بھی اپنی تاریخ میں اس حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ ایک چشمہ کا پانی اتنے بڑے قافلے اور ان کے ریوڑ کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ ناقل)

حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل جو فرعون کے ظلم سے ڈر کر بھاگے تھے ان کی تعداد صرف چند ہزار تھی۔ ورنہ پچیس لاکھ یہودی فلسطین کے چھوٹے چھوٹے قبائل سے ڈر کس طرح سکتے تھے۔ فلسطین کی آبادی تو اپنی شان و شوکت کے زمانہ میں بھی 30,25 لاکھ سے زیادہ نہیں بڑھی۔ بلکہ اس زمانہ میں بھی تقسیم سے پہلے اس کی آبادی اٹھارہ لاکھ کے قریب تھی پرانے زمانہ میں جبکہ خوراک ادھر ادھر پہنچانے کے سامان مفقود تھے غیر زرعی علاقوں میں بڑی آبادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

پس موسیٰؑ کے وقت میں یقیناً سارے فلسطین کی آبادی چند ہزار افراد پر مشتمل ہو گی۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور ان کے دشمنوں کی لڑائیوں میں ہمیشہ سینکڑوں اور ہزاروں افراد کا ہی پتہ لگتا ہے۔ اگر موسیٰؑ کے ساتھ 25 لاکھ آدمی فلسطین میں آئے تھے تو سفر کا زمانہ تو الگ رہا حکومت کے زمانے میں بھی ان کی خوراک کا انتظام نہ ہو سکتا تھا اور لڑائی کا تو ذکر ہی کیا ہے یہ لوگ تو اپنے کندھوں کے دھکوں سے ہی ان چند ہزار افراد سے فلسطین کو خالی کرا سکتے تھے جو ان سے پہلے وہاں بس رہے تھے۔ پس وَهُمْ اُلُوْفٌ (البقرۃ:244) میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بنی اسرائیل ہی ہیں۔"

(تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مصلح موعودؓ جلد 3 صفحہ 388، 389 مطبوعہ اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز یو۔کے 2023ء)

آپؓ مزید فرماتے ہیں:

"بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر کنعان کی طرف آئے تو جس علاقہ میں سے انہیں گذرنا پڑا وہ بہت غیر آباد تھا اور دور دراز فاصلہ پر بعض شہر آباد تھے۔ اب تک یہ علاقہ ایسا ہی ہے اور اب بھی اس علاقہ سے گذرنا کوئی آسان کام نہیں بے شک اس علاقہ میں اب ریل جاری ہو گئی ہے اور سفر میں سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں لیکن اس کی غیر آبادی میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ یہ علاقہ آبادی کے قابل زمینوں سے خالی ہے۔ اور بے آب و گیاہ میدانوں پر مشتمل ہے۔

ترکوں نے جنگ عظیم میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح مصر میں داخل ہو کر انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات قطع کر دیں لیکن پانی کی دقت اور سامان خورونوش کی کمی کی وجہ سے عقلوں کو حیرت میں ڈال دینے والی قربانی کے باوجود وہ

اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ انگریزوں نے بھی شروع میں بہت زور مارا لیکن خشک اور چٹیل میدانوں کی وجہ سے وہ بھی سویز کے راستہ سے فلسطین میں داخلہ نہ ہوسکے۔ آخر جنرل ایلنبی نے نیل سے پانی لے کر سویز کے اوپر سے نلوں کے ذریعہ سے پانی گذاراااور اس علاقہ کو جو بڑے شہروں کے لئے ناقابل تھا قابل سکونت بنادیا۔۔۔

نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں نہ معلوم کتنے اسلامی اور مسیحی لشکر پانی نہ ملنے اور کھانے کی کمی کے سبب اس دشت میں تباہ ہوگئے تھے۔

پانی کی کمی کے سبب گذرنے والے قافلوں کو لازماًان چشموں یا تالابوں کے پاس سے گذرنا پڑتا تھا جو کہیں کہیں اس دشت میں پائے جاتے تھے اور اس وجہ سے جو فریق بھی غالب ہوتا تھا۔ اسے دوسرے فریق کے آدمیوں کو مارنے کا ایک آسان بہانہ مل جاتا تھا۔ کیونکہ تھوڑے سے آدمی ان چشموں یا تالابوں پر مقرر کردینے سے بھی اس بات کی کافی ضمانت ہوجاتی تھی کہ حریف کے آدمی نقصان اٹھائے بغیر مصر سے فلسطین کی طرف نہیں جاسکتے۔ چنانچہ اسامہ بن منقذ اپنی کتاب الاعتبار میں لکھتے ہیں کہ الجعفر نامی چشمہ جو مصر اور فلسطین کے درمیان تھا کسی وقت فرنگیوں سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اس جگہ سے لوگوں کو بچ کر جانا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ انہیں سیف الدین ابن سالار وزیر مصر نے شاہ نورالدین کے پاس بھیجا کہ وہ طبریہ پر حملہ کریں تو ہم مصر سے غزہ پر حملہ کرکے فرنگیوں کو وہاں قلعہ بنانے سے روک دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم الجعفر چشمہ پر پہنچے تو اتفاقاً اس وقت فرنگی وہاں موجود نہ تھے۔ لیکن طے قبیلہ میں سے بنوابی خاندان کے کچھ لوگ وہاں تھے جن کے جسم پر چمڑے کے سوا گوشت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور بالکل بدحال ہورہے تھے وہ کہتے ہیں میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کس طرح گذارہ کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ مردار کی ہڈیاں ابال کر اس پر گذارہ کرتے ہیں اور کوئی چیز کھانے کی یہاں نہیں ہے۔ ان کے کتے بھی اسی پر گذارہ کرتے تھے۔ ہاں گھوڑے چشمے کے اردگرد کی گھاس پر گذارہ کرتے تھے۔ اسامہ لکھتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہو۔ دمشق کی طرف کیوں نہیں چلے جاتے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس خیال سے کہ وہاں کی وباؤں سے ہمیں نقصان نہ پہنچے۔ اسامہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کیسے بیوقوف لوگ تھے ان کی اس وقت کی حالت سے بڑھ کر وباء کیا نقصان پہنچاسکتی تھی۔(کتاب الاعتبار لابن منکز صفحہ 607)

غرض دشت سینا ایک ایسا خطرناک علاقہ ہے کہ بڑی جماعتوں کے لئے بھی بغیر خاص انتظام کے اس میں سے

گذرنا مشکل ہے اور اس میں قیام کرنا تو اور بھی مصیبت ہے۔ پھر بنی اسرائیل جن کے بیس سال سے زائد عمر کے نوجوانوں میں سے جنگی خدمت کے قابل مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے (یہ تعداد بائبل کی رو سے ہے ورنہ ہم اس کو صریح غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم اس بارہ میں یہ فرماتا ہے کہ وَهُمْ اُلُوْفٌ (البقرۃ:244) وہ ساری قوم اس وقت ہزاروں کی تعداد میں تھی اور قرآنی بیان ہی عقل کے مطابق اور سچا ہے اور جو بے سروسامانی کی حالت میں مصر سے بھاگے تھے اس علاقہ میں سے کس طرح گذرے اور کس طرح اڑتیس سال تک اس علاقہ میں انہوں نے بسر کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو صدیوں سے دنیا کو حیرت میں ڈال رہا ہے۔ بائبل نے اس کا جواب من کے نزول اور حورب کی چٹان میں بارہ چشموں کے پھوٹنے کے معجزہ سے دیا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مظلوم قوم کی خدا تعالیٰ نے مدد کی اور اپنے فضل سے اس نے ان کے لئے کھانے اور پینے کا سامان مہیا کیا۔"

(تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مصلح موعودؓ جلد7 صفحہ 535 تا 537 مطبوعہ اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز یو۔کے 2023ء)

پھر مزید فرماتے ہیں:

"برنارڈٹ جرمن سیاح کا بیان ہے کہ سینا میں موجودہ درختوں کی تعداد کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ سالانہ اڑھائی تین سو سیر تک "مَنّ" تیار ہو سکتا ہے مگر خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے زمانہ میں جنگل زیادہ وسیع ہوتا تھا اور اس سے بہت زیادہ من تیار ہو سکتا تھا۔

بائبل میں بنی اسرائیل کی جو تعداد لکھی ہے اس کے مطابق انہیں روزانہ چھبیس ہزار سات سو پچاس من کے قریب من کی ضرورت ہوتی ہو گی۔ اور سالانہ ایک کروڑ من کے قریب لیکن اڑہائی تین سو سیر سالانہ جواب وہاں پیدا ہوتا ہے اور ایک کروڑ من جس کی انہیں ضرورت ہوتی تھی ان دونوں اندازوں میں اس قدر فرق ہے کہ خواہ قوت واہمہ کو کتنا ہی آزاد چھوڑ دیا جائے خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی زمانہ میں اس علاقہ میں اس قدر جنگل تھا کہ ایک کروڑ من "مَنّ" پیدا ہو جاتا تھا خصوصاً جب ہم اس امر کو مدّ نظر رکھیں کہ اس علاقہ کا اکثر حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

اس مشکل کا ایک حل تو یہ ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ بائبل میں جو تعداد بنی اسرائیل کی لکھی ہے۔ وہ مبالغہ آمیز ہے۔ گنتی باب 1 سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بیس سال سے زائد عمر کے لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد بارہویں قبیلہ کو چھوڑ کر جن کی گنتی نہیں کی گئی چھ لاکھ تین ہزار اور پانچ سو پچاس تھی۔

اگر بارہویں قبیلہ کا اندازہ کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کل لڑنے کے قابل مرد ساڑھے چھ لاکھ تھے عورتوں

بچوں اور جنگ کے ناقابل بوڑھوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے ہم اس تعداد کو دس گنا زیادہ کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ایک عام اندازہ ہے کہ چھ فیصدی سے لے کر دس فیصدی تک ملک کی آبادی جنگی خدمت کے قابل ہوتی ہے۔

ہم خیال کر لیتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے سختی سے جنگی خدمت لی جاتی تھی اور کل تعداد بنی اسرائیل کی جنگی سپاہیوں سے صرف دس گنا تھی یعنی ساٹھ لاکھ مگر عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تھے کیونکہ اتنے آدمی مصر سے اتنے قلیل عرصہ میں نکل ہی نہیں سکتے تھے پھر یردن پار کی بستی جس میں آکر وہ بسے ہیں اس قدر آبادی کی حامل نہیں ہو سکتی فلسطین کی آبادی کا اندازہ 1926ء میں آٹھ لاکھ باون ہزار دو سو اڑسٹھ (852268) تھا (Encyclopædia Britannica 14th Edition) اور اس ملک کا کل رقبہ 9 ہزار مربع میل ہے اور پھر اس کا ایک بڑا حصہ ناقابل سکونت ہے۔ صرف ریت کے میدان ہیں جنہیں آباد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اب بھی جبکہ یہودیوں نے امریکہ کی مدد سے اسے آباد کیا ہے اس کی کل آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ پس اس ملک میں جو پہلے سے آباد تھا ساٹھ لاکھ آدمیوں کا آکر بس جانا بالکل خلاف عقل ہے۔"

(تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مصلح موعودؓ جلد 7 صفحہ 540، 541 مطبوعہ اسلام انٹر نیشنل پبلیکیشنز یو۔ کے 2023ء)

پھر Peake لکھتا ہے:

"A body of 2000,000 persons is far beyond the capacity of Sinaitic peninsula to support, for the country is largely desert broken only by occasional spots of verdure, where the soil is irrigated by springs and its present population is calculated to be only 4000 or 6000."[1]

مفہوماً ترجمہ: بیس لاکھ کے گروہ کی ضروریات پوری کرنا جزیرہ نما سیناء کی استطاعت سے باہر ہے کیونکہ ملک کا بیشتر حصہ صحراء پر مشتمل ہے جہاں بہت کم مقامات پر سبزہ ہے وہاں بھی زمین چشموں کے پانی سے سیراب ہوتی ہے۔ اور اس کی موجودہ آبادی 4000 سے 6000 تک بتائی جاتی ہے۔

سیناء میں پائے جانے والے چھوٹے چھوٹے چشموں اور تیس، پینتیس لاکھ افراد کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ایک امریکن عیسائی محقق لکھتا ہے:

"However, the amount of water generated by the springs was hardly

---

[1]Peake M.A, D.D., *A Commentry of the Bible*, Thomas Nelson and sons LTD. Printed in 1919 p:214

sufficient quench the thirst of the large mass of people assembled there, which, according the biblical account of the exodus included no less than six hundred thousand men of military age and their families."[1]

مفہوماً ترجمہ: تاہم، چشموں سے نکلنے والے پانی کی مقدار مشکل سے اس قدر مجمعِ افراد کی پیاس بجھانے کے لئے کافی ہوتا ہوگا۔ جو بائبل کے نزدیک خروج کے موقع پر جنگی قابلیت کے مرد چھ لاکھ سے کم نہ تھے اور ان کے خاندان بھی۔

یہی نہیں بلکہ (Josephus) جوزیفس بھی اپنی تاریخ میں اس بات کو بڑی حیرانی سے پیش کرتا ہے کہ ایک چشمہ کبھی بھی اتنے بڑے قافلہ اور ان کے ریوڈ کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔[2]

الغرض محققین جب بلیکل نظریہ کو ان پیچیدگیوں اور مشکلات کے پیشِ نظر مثبت ثابت کرنے سے عاجز آجاتے ہیں تو وہ سٹ پٹا کر یہ لکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ:

"There is no easy solution to the question of number of people who took part in the exodus and the problem is of mere importance that might at first seem the case".[3]

مفہوماً ترجمہ: اس سوال کا کوئی آسان حل نہیں کہ کہ کتنے لوگوں نے خروج میں حصہ لیا اور مسائل اس سے بھی اہم ہیں جو بادی النظر میں اس معاملہ کے حوالے سے معلوم ہوتے ہیں۔

کاتبین بائبل کی بنی اسرائیل کی تعداد میں مبالغہ کی وجہ:

دراصل اس سارے مسئلہ کی اصل وجہ اس پیشگوئی کا غلط مطلب اخذ کرنے میں ہے جس میں خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تیری نسل کے لوگوں کو آسمان کے ستاروں کی مانند بڑھاؤں گا۔ بائبل میں متعدد مقامات پر اس پیشگوئی کا اشارۃً وکنایۃً اعادہ کیا گیاہے۔ یوں لگتا ہے کہ جب کاتبین بائبل نے اس پیشگوئی کو درج کیا تو اس کی شان و شوکت کو بڑھانے کے لئے نہایت مبالغہ آمیزی سے کام لیا حالانکہ انہیں یہ سوچنا چاہئے تھا کہ پیشگوئی کی عظمت کسی

[1]Martin Sicker, *The Convocation at Sinai: A Study in Biblical Interpretation*, I Universe, 2008 p:36
[2]William Whitson, *The Work of Flavius Josephus*, Translated, John Childs and Son. Bungay pp:79-80
[3]Alfred Hoerth, *Archaeology and The Old Testament*, Published by: Baker Book House, Michigen, 1999. p:178

شخص کے مبالغہ آمیز الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ پیشگوئی قانون قدرت میں رہتے ہوئے اپنے وقت پر پوری ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا پیشگوئی کی عظمت یہ تھی کہ ایک سو سالہ بوڑھے شخص جس کی بیوی بھی بانجھ ہو اسے خدا تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ میں تیری نسل کو آسمان کے ستاروں کی مانند بڑھاؤں گا جس میں اس کی نسل جاری ہونے اور کثرت سے پھیلنے کی طرف اشارہ تھا جو کہ قانونِ پیدائش کی مقررہ کردہ معیاد میں ہی پوری ہو سکتی ہے وقتِ مقررہ سے پہلے کسی پیشگوئی کے پورا ہونے کی امید رکھنا ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی شخص کی شادی ہو اور ڈاکٹر اسے بتائے کہ تمہارے اولاد ہو گی وہ اگلے ہی دن وہ توقع رکھے کہ میری تو اولاد ہونی چاہیئے۔ الغرض مذکورہ بالا پیشگوئی کے تسلسل میں بنی اسرائیل کا چوتھی پشت میں ہزاروں ہو جانا یہ بھی کسی معجزہ سے کم نہیں نیز ایسا ہو جانا اس پیشگوئی کے مقام کو بھی کم نہیں کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک عیسائی محقق لکھتا ہے:

"A reduced number diminishes neither the scope of the miracle nor the power of God as He guided His people".[1]

مفہوماً ترجمہ: کم تعداد نہ تو معجزہ کے مقام کو کم کرتی ہے نہ ہی خدا کی قوت کو جیسے اس نے اپنے لوگوں کی راہنمائی کی۔

حرف آخر

مذکورہ بالا بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عقلی و نقلی دلائل کے علاوہ تحقیقات جدیدہ بھی قرآنی بیان وَ ھُمۡ اُلُوۡفٌ (البقرۃ:244) کی مؤید ہیں اور بائبل کی بیان کردہ تعداد غلط اور مبالغہ آمیز ہے۔ پس ان حوالہ جات سے قرآنی صداقت اظہر من الشمس ہے۔ یہ کتنا بڑا اعجاز ہے کہ جو بات اتنے لمبے عرصہ کی تحقیق کے بعد اب ثابت ہو رہی ہے وہ قرآن مجید میں پہلے سے موجود ہے۔

[1] Alfred Hoerth, *Archaeology and The Old Testament*, Published by Baker Book House, Michigen, 1999. p:178

مستشرقین کے ایک اعتراض کا جواب

قرآن مجید اور عقیدہ تثلیث

يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِيۡ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

عیسائی مستشرقین کی طرف سے قرآن مجید پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن نے سورۃ مائدہ میں ایک جگہ تو یہ ذکر کیا ہے کہ عیسائی تین خداؤں کے قائل ہیں اور دوسری جگہ یہ بیان ہے کہ نصاریٰ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر حضرت عیسیٰؑ اور اس کی ماں کو "الٰہین" سمجھتے ہیں یعنی "دو معبود" بنائے ہوئے ہیں۔ گویا دوسری جگہ تثلیث کی تفصیل بیان کی گئی یعنی خدا، مسیح اور مریم۔ اِس قسم کی تثلیث کے مسیحی قائل نہیں ہیں۔ اسلام سے تین سو سال پہلے کی عیسائی کونسل میں باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے تثلیث کا عقیدہ منظور ہو چکا تھا اور قرآنی بیان آنحضرت ﷺ کے مسیحی عقائد کے بارہ میں مبہم علم کا نتیجہ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی اعتراض پر مسیحی عقائد اور تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون محترم شیخ عبد القادر صاحب (مرحوم، محقق عیسائیت) کے اس موضوع پر لکھے گئے مضامین کا خلاصہ ہے جس کو مناسب تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ (مرتبہ اے۔ آر۔ سدھو)

قرآن مجید کی سورۃ مائدہ میں ایک جگہ مسیحی عقیدہ تثلیث کا باطل ہونا اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهُوۡا عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۔(سورۃ المائدہ: 74)

ترجمہ: یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے (بھی) جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے ایک ہے۔ حالانکہ ایک ہی معبود کے

سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اگر وہ اس سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو ان میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا دردناک عذاب ضرور آئے گا۔

اسی سورۃ میں آگے چل کر روز قیامت کے حوالہ سے خدا تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک مکالمہ کا ذکر ہے۔ جس میں خدا تعالیٰ کے حضرت عیسیٰؑ سے مسیحیت میں غلط عقائد کے راہ پا جانے کے متعلق سوال کا اور پھر حضرت عیسیٰ کے جواب کا ذکر اس طرح ہے:

وَ اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَ اُمِّیَ اِلٰہَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قَالَ سُبۡحٰنَکَ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَیۡسَ لِیۡ ٭ بِحَقٍّ ؕ اِنۡ کُنۡتُ قُلۡتُہٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَہٗ ؕ تَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِیۡ وَ لَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِکَ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ○ مَا قُلۡتُ لَہُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِہٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَ رَبَّکُمۡ ۚ وَ کُنۡتُ عَلَیۡہِمۡ شَہِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡہِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ اَنۡتَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ۔ (سورۃ المائدہ: 117،118)

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب اللہ عیسیٰ ابنِ مریم سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنالو؟ وہ کہے گا پاک ہے تو۔ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہ ہو۔ اگر میں نے وہ بات کہی ہوتی تو ضرور تو اسے جان لیتا۔ تو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے۔ یقیناً تو تمام عیبوں کا خوب جاننے والا ہے۔

میں نے انہیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جو تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اور میں ان پر نگران تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پس جب تو نے مجھے وفات دے دی فقط ایک تو ہی ان پر نگران رہا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

مذکورہ بالا آیات کے حوالہ سے "ینابیع الاسلام"[1] کے مصنف ریورنڈ سینٹ کلیئر ٹزڈل (Rev.St. Clair Tisdall) نے اپنی ایک اور کتاب The Original Sources of the Qur'an میں عقیدہ تثلیث کے بارہ میں قرآنِ مجید

---

[1] ینابیع الاسلام (The Sources of Islam) سینٹ کلیئر ٹزڈل کی وہ کتاب ہے جس میں اس نے یہ الزام لگایا ہے کہ اسلامی تعلیمات یہودی اور عیسائی ماخذوں سے لی گئی ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام نے اپنی کتاب چشمہ مسیحی تحریر فرمائی۔ جس میں آپ نے مسیحی عقائد کا مختصر اور جامع رد پیش فرمانے کے ساتھ اناجیل کی الہامی حیثیت کو چیلنج کیا اور ان کے مختلف کتابوں سے ماخوذ ہونے کے ثبوت پیش فرمائے ہیں۔

اور بانی اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انکو صحیح مسیحی عقائد کا ادراک نہ تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"...Muhammad heard certain Christians make that there are three Gods, that is to say God the Father, Mary, and Jesus. It is perfectly plain from these verses that Muhammad really did believe that the Christian doctrine inculcated belief in three separate Divine persons, Jesus and Mary being two of them. But our third quotation implies that Muhammad probably from what he had seen of "Christian" worship thought that the order was Jesus, Mary, God, or Mary, Jesus, God. … We must all feel regret that the idolatrous worship offered to Mary led Muhammad to believe that people who called her "Queen of Heaven" and "Mother of God" really attributed to her Divine attributes."[1]

مفہوماً ترجمہ: محمد (ﷺ) نے بعض عیسائیوں کو یہ کہتے سنا کہ تین خدا ہیں، یعنی باپ خدا، مریم اور عیسیٰ۔ ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ محمد (ﷺ) واقعی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مسیحی نظریے نے تین الگ الگ ہستیوں پر ایمان کا نظریہ پیدا کیا، عیسیٰ اور مریم ان میں سے دو ہیں۔ لیکن ہمارا تیسرا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ محمد (ﷺ) شاید اس سے جو انہوں نے مسیحی عبادت کے بارے میں دیکھا تھا، سوچا کہ (تثلیث کی) ترتیب عیسیٰ، مریم اور خدا، یا مریم، عیسیٰ اور خدا تھی۔... ہم سب کو اس بات پر افسوس ہونا چاہیئے کہ مریم کو پیش کی جانے والی بت پرستانہ عبادت نے محمد (ﷺ) کو اس بات پر یقین دلایا کہ وہ لوگ جنہوں نے اسے "آسمان کی ملکہ" اور "خدا کی ماں" کہا، واقعی اس کی طرف الٰہی صفات منسوب کرتے ہیں۔

اسی طرح منٹگمری واٹ (W. Montgomery Watt) اپنی کتاب Muhammad at Medina میں لکھتا ہے:

"One of the remarkable features of the relationship between Muslims and Christians is that neither Muhammad nor any of the Companions seems to have been aware of some of the fundamental Christian doctrines. Apart from

[1]Rev. W. St. Clair Tisdall, *The Original Sources Of The Qur'an*, 1905, Society For The Promotion Of Christian Knowledge, London, pp: 180-181.

the reference to the crucifixion (which is primarily a denial of Jewish claim), and the mention of the twelve apostles as the 'helpers' of Jesus, and of the miracles of healing and raising the dead, there is nothing in the Qur'an about the adult life and teaching of Jesus as recorded in the New Testament. The early Muslims gave Jesus the title Messiah (Masih) but did not appreciate that it involved a claim to be 'God's anointed'. They did not understand the distinctive work of Jesus in redeeming the world and atoning for its sins. They did not realize that the Holy Spirit was regarded by Christians as the third person in the Godhead. It is indeed remarkable that there should have been among the Muslims over such a wide area this absence of knowledge of Christianity. The blame for this state of affairs probably rests on those Christians with whom Muhammad and his Companions were in contact, who may themselves have had little appreciation of the doctrines mentioned. Nevertheless the 'absence of knowledge' remains, and in the thirteen centuries since Muhammad's time few Muslims have done anything to fill the lacuna."[1]

مفہوماً ترجمہ: مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلق کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ نہ تو محمد اور نہ ہی کسی صحابی کو بعض بنیادی عیسائی عقائد کا علم تھا۔ مصلوبیت کے حوالہ کے علاوہ (جو بنیادی طور پر یہودیوں کے دعوے کی تردید ہے)، اور بارہ رسولوں کو یسوع کے 'مددگار' کے طور پر ذکر کرنے اور مردوں کو شفا دینے اور زندہ کرنے کے معجزات کے علاوہ، یسوع کی بالغ زندگی اور تعلیم کے بارے میں قرآن میں کچھ بھی نہیں ہے جیسا کہ نئے عہد نامہ میں درج ہے۔ ابتدائی مسلمانوں نے یسوع کو مسیحا (مسیح) کا خطاب دیا لیکن اس بات کی تعریف نہیں کی کہ اس میں "خدا کا ممسوح" ہونے کا دعویٰ شامل ہے۔ وہ دنیا کو چھڑانے اور اس کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے میں یسوع کے مخصوص کام کو نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ روح القدس کو مسیحی خدائی میں تیسرا اقنوم سمجھتے ہیں۔ یہ واقعی قابل ذکر ہے کہ اتنے وسیع علاقے میں مسلمانوں کے درمیان عیسائیت کے بارہ میں علم کا یہ فقدان ہونا چاہیے تھا؟ اس کیفیت کا قصور غالباً ان عیسائیوں پر عائد ہوتا

[1] W. M. Watt, *Muhammad At Medina*, 1956, Oxford At The Clarendon Press, p: 320.

ہے جن کے ساتھ محمد اور ان کے ساتھی رابطے میں تھے، جو خود مذکورہ عقائد کا بہت کم فہم رکھتے تھے۔ قصہ مختصر علم کی کمی موجود ہے، اور محمد کے زمانے سے لے کر تیرہ صدیوں میں بہت کم مسلمانوں نے اس کمی کو پر کرنے کے لیے کچھ کیا ہے۔

سینٹ کلیئر ٹزڈل اور منٹگمری واٹ کے مذکورہ حوالہ جات سے واضح ہے کہ یہ مستشرقین نعوذ باللہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کو مسیحی عقائد کا اتناہی علم تھا جو ان کے ارد گرد کے مسیحیوں سے معلوم ہوا اور اسی کو انہوں نے قرآن میں بیان کر دیا۔ اور مزید یہ کہ محمد ﷺ کے ارد گرد رہنے والے مسیحی خود بھی صحیح عقائد نہ رکھتے تھے اس لیے محمد ﷺ کی بجائے وہ زیادہ قصوروار ہیں کہ ان کی وجہ سے قرآن میں مسیحی عقائد کے بارہ میں غلط باتیں شامل ہو گئیں۔ اور انہیں غلط عقائد میں سے تثلیث کا عقیدہ بھی ہے جس کا محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کو بھی درست علم نہ تھا اور انہوں نے روح القدس کی جگہ حضرت مریم کو تثلیث کا تیسرا اقنوم لکھ دیا۔ (نعوذ باللہ)

مستشرقین کا یہ اعتراض کہ آنحضرت ﷺ حضرت مریمؑ کو ایک اقنوم سمجھتے تھے، یہ بات تب درست ہو جب قرآن مجید میں یہ لکھا ہو کہ حضرت مریم اقنوم ثلیث ہیں۔ قرآن مجید تو یہ کہتا ہے کہ مریم اور ابن مریم دونوں کو پُوجا گیا۔

سورۃ مائدہ میں جہاں یہ ذکر ہے کہ عیسائی اللہ تعالیٰ کو تین میں سے ایک سمجھتے ہیں وہاں وہی ثلیت مراد ہے جو کہ نیقیا کی کونسل میں 325عیسوی میں متعین کی گئی یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ اِسی سورۃ میں دوسری جگہ اقانیم کا نہیں بلکہ محض معبود بنانے کا ذکر ہے۔ حضرت مسیحؑ سے آئندہ جہاں میں یہ پوچھا گیا کہ آپ نے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ دو معبود بنالو۔ ان الفاظ میں عیسائی کونسل کے عقیدہ ثلیت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ مریم اور ابن مریم کے پُجنے کا ذکر ہے۔ اب اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ باوجودیکہ عیسائی باپ، بیٹا اور روح القدس کو خدا سمجھتے ہیں لیکن حضرت مریم کے بھی وہ ہر دُور میں پجاری رہے ہیں۔

مسیحی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ نظریاتی تثلیث یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس پر ایمان رکھنے کے باوجود لوگوں نے حصرت مسیحؑ کے ساتھ مریمؑ کی پرستش کو شعار بنالیا۔ مریم کے مجسّمے بنا کر گرجوں میں رکھے گئے۔ ان کو "Theotokos"(خدا کی ماں) کا خطاب دیا گیا۔ ان سے دعائیں اور مناجات کی گئیں۔ ان کو دعاؤں کی قبولیت اور خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھا گیا اور رفتہ رفتہ مریم کی باقاعدہ پرستش شروع ہوگئی۔ عرب میں چوتھی صدی عیسوی میں Collyridians مسیحی فرقہ کے لوگ حضرت مریم کی عبادت اسی طرح کرتے تھے۔ جیسے اس سے قبل کنعانی دیوی "استارہ"(Ashtaroth) کی پوجا کی جاتی تھی۔[1]

[1] J. M. Robertson, *A SHORT HISTORY OF CHRISTIANITY*,1937, WATTS & CO.LONDON, p:109

یہی نہیں بلکہ سب سے بڑا مسیحی فرقہ کیتھولک آج بھی اپنی عبادات میں حضرت مریم کو شامل کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ کیتھولکس نے آج اپنی عبادت کو تین حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

(1) لاٹریا(Latria) یہ صرف خدا یا یسوع کی عبادت ہے۔

(2) ہاپرڈولیا(Hyperdulia) یہ پرستش "خدا کی ماں"، "مبارک کنواری" حضرت مریم سے متعلق ہے۔

(3) ڈولیا(Dulia) یہ عیسائی مقدسین کی تعظیم و تکریم اور ان کے واسطہ سے پرستش ہے۔

اِس تقسیم میں بظاہر اختلاف مدارج کو ملحوظ رکھا گیا لیکن عمل میں بعض دفعہ اس تمیز کو قائم نہیں رکھا جاتا۔

ریورنڈ کینن۔ڈبلیو۔پی۔ہیرس نے رومن کیتھولک کے عقائد کے خلاف ایک کتاب "رومن کیتھولک کلیسیا کی تعلیم (کیا وہ سچی ہے)" کے عنوان سے لکھی جس کا ایک باب "مسئلہ پرستش مریم" کے نام سے ہے۔ اس میں انہوں نے پرستشِ مریم کے حوالہ سے مختلف کیتھولک کتب سے اقتباسات دے کر ثابت کیا ہے کہ کیتھولک واقعی حضرت مریم کی پرستش کرتے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں اسی کتاب سے چند کیتھولک کتب کے اقتباسات درج ہیں:

کیتھولک کتاب "مقدس دل کی عبادت" میں لکھا ہے:

"کلیسا نے پاک روح کی تعلیم اور مدد سے مریم کو وہ لقب دیئے ہیں جو اس کے الٰہی بیٹے کے لئے ہیں۔ یسوع ہمارا بادشاہ ہے اور مریم ہماری ملکہ ہے۔ یسوع ہمارا وکیل اور درمیانی ہے۔ مریم بھی ہماری درمیانی ہے۔ یسوع ہماری امید، ہماری پناہ، ہماری تسلی ہے۔ اور یہی مریم کے بارہ میں کہتے ہیں۔ یسوع آسمان پر جانے کا راستہ ہے، مریم آسمان کا دروازہ ہے۔ یسوع ہمارا رہنما، ہماری زندگی کے راستہ کی روشنی ہے۔ مریم وہ ستارہ ہے جو ہمیں نجات کی بندرگاہ تک راہنمائی کرتا ہے اور پہنچاتا ہے۔ یسوع فضل کا سرچشمہ ہے، مریم فضل کی ماں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ مریم فضل سے ان سب القاب میں شامل ہے جو یسوع کو ذاتی طور پر حاصل ہیں۔"[1]

رومن کیتھولک اِن القابات پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ مریم کو وہ عہدے اور مناسب بھی دیتے ہیں جو کہ پراٹسٹنٹ عیسائیوں کے نزدیک یسوع سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ ایک اور کیتھولک کتاب "کنواری کا آئینہ" (Virgin’s Looking Glass) میں لکھا ہے:

"مریم ہماری شہزادی ہے جو حقیقی طور پر آسمان، زمین اور زمین سے نیچے کی کل چیزوں پر

[1] "مقدس دل کی عبادت" بحوالہ "رومن کاتھولک کلیسیا کی تعلیم (کیا وہ سچی ہے؟)" مصنفہ ریورنڈ کینن۔ڈبلیو۔پی۔ہیرس۔ مطبوعہ گوجرہ۔پنجاب صفحہ 211

حاکمہ ہے۔فرشتوں کی حاکمہ ہے۔انسانوں کی حاکمہ ،شیطانوں کیحاکمہ ،آسمان کی ہر شے کی حاکمہ،دنیا کی حاکمہ اور دوزخ میں بھی حاکمہ‘‘[1]

اسی طرح ایک اور کیتھولک کتاب ’’مریم کا پاکیزہ دل‘‘میں لکھا ہے:

’’ہم سب کے لئے مریم رحم کی ماں ہے گناہگاروں کی پناہ،مصیبت زدوں کو تسلّی دینے والی۔اور جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں ان کے لئے نجات ہے... مریم کی بغل میں رحم کا سمندر ہے۔جہاں سے قیدیوں کو رہائی ، بیماروں اور کمزوروں کو صحت،مصیبت زدوں کو تسلّی ، گناہ گاروں کو معافی اور نیکوں کو فضل پر فضل آزادی سے مل سکتا ہے... آؤ ہم یسوع کے الٰہی دل اور مریم کے پاکیزہ دل کو ہمیشہ اور ہر جگہ یاد کریں۔اس کی تعریف کریں۔اس کو مبارک کہیں۔اس کی عبادت کریں۔اس کی تجلیل کریں۔‘‘[2]

پوپ پائیس نہم اپنے کلیسیائی خط(محررہ 8دسمبر 1864ء)میں جو مختلف کیتھولک چرچوں کو لکھا گیا، میں لکھتے ہیں:

’’تاکہ خدا ہماری اور آپ کی اور دیگر ایمانداروں کی دعاوں کو آسانی سے منظور کرے ہمیں کمال بھروسہ کے ساتھ کنواری مریم خدا کی ماں کو بطور (واسطہ) درمیانی استعمال کرنا چاہیئے۔جس نے تمام بدعتوں کو نیست کیا۔اور جو ہم سب کی پیاری ماں ہے۔وہ فضل کرنے والی اور رحم سے بھرپور ہے۔اور چاہتی ہے کہ سب اس سے دعائیں مانگیں۔وہ سب پر مہربانی کرتی ہے۔اور چونکہ بطور ملکہ اپنے اکلوتے بیٹے کے دہنے ہاتھ بیٹھی ہے۔ایسی کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو وہ ہمیں اس سے دلا نہیں سکتی۔‘‘[3]

اسی طرح ریورنڈ پی۔ہیرس اپنی اسی کتاب کے اسی باب ’’مسئلہ پرستش مریم‘‘کے شروع میں لکھتے لکھتے ہیں:

’’رومن کاتھولک مریم کی قدر کرتے کرتے اس کو خدا کے آسمانی تخت پر جابٹھاتے ہیں اور اُسے ایسی صفات سے ملقّب کرتے ہیں اور اُس کی اِس طور پر پرستش کرتے ہیں کہ مبارک کنواری کی الٰہی ذات سے علیحدگی نظر نہیں آتی۔‘‘[4]

---

[1] ’’کنواری کا آئینہ ‘‘بحوالہ ’’ رومن کاتھولک کلیسیا کی تعلیم (کیاوہ سچی ہے ؟)‘‘مصنفہ ریورنڈ کینن۔ڈبلیو۔پی۔ہیرس۔ مطبوعہ گوجرہ پنجاب صفحہ 211

[2] ’’مریم کا پاکیزہ دل‘‘بحوالہ ’’رومن کاتھولک کلیسیا کی تعلیم (کیاوہ سچی ہے ؟)‘‘مصنفہ ریورنڈ کینن۔ڈبلیو۔پی۔ہیرس۔ مطبوعہ گوجرہ پنجاب صفحہ 212

[3] پوپ پائیس نہم کا خط بحوالہ ’’رومن کاتھولک کلیسیا کی تعلیم (کیاوہ سچی ہے ؟)‘‘مصنفہ ریورنڈ کینن۔ڈبلیو۔پی۔ہیرس۔ مطبوعہ گوجرہ پنجاب صفحہ 206 تا 207

[4] ’’رومن کاتھولک کلیسیا کی تعلیم (کیاوہ سچی ہے ؟)‘‘مصنفہ ریورنڈ کینن۔ڈبلیو۔پی۔ہیرس۔ مطبوعہ گوجرہ پنجاب صفحہ 200

پس مذکورہ بالا حوالوں سے ظاہر ہے کہ سب سے بڑا مسیحی فرقہ کیتھولک کس طرح حضرت مریمؑ کے مقام کو بڑھاتے بڑھاتے انہیں الوہی صفات سے متصف کر دیتا ہے اور نظریاتی تثلیث کو ماننے کے باوجود حضرت مریمؑ کی پرستش بھی کرتا چلا آیا ہے۔ پس اسی بات کی طرف قرآن مجید کی سورۃ مائدہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

عیسائی عقیدہ اور عمل کے اِس تضاد کو عصرِ حاضر کے محققین نے بھی محسوس کیا ہے۔J.M.Robertson اپنی کتابA Short History of Christianity میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرونِ اولیٰ میں عقیدہ تثلیث مشرکین روما سے اخذ کیا گیا۔ مصر میں زمانہ قدیم سے ایک تثلیث پوجی جارہی تھی۔ اس تثلیث کے تین اقنوم اُسائرس دیوتا(Osiris)، اس کی بیوی آئیسس(Isis) اور اس کا بیٹا ہورس(Horus) تھے۔ بعد ازاں ان دیوتوں کی پرستش سارے روما میں پھیل گئی۔ بعد کے بگڑے ہوئے رومی عیسائیوں نے اس تثلیث کا نعم البدل باپ، بیٹا اور روح القدس کو بنالیا لیکن چونکہ عوام الناس کی گھٹی میں باپ، ماں اور بیٹے کی عبادت رچی ہوئی تھی۔ وہ مانتے تو نظریاتی تثلث کو رہے لیکن مریم اور ابن مریم کی عبادت سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے۔ رومائے قدیم کے مجسموں میں آئی سس(Isis) دیوی کی آغوش میں اس کے شیر خوار بیٹے ہورس(Horus) کو دکھایا گیا ہے۔ یہی مجسمے ’’مریم کی آغوش میں یسوع‘‘ کے طور پر پرستش کیے جانے لگے۔ مریم کی عزّت اِس حد تک بڑھائی گئی کہ اسے ’’خدا کی ماں‘‘ کا خطاب دیدیا گیا۔ نسطوریس(Nestorius) جو پانچویں صدی عیسوی(386-451) کا ایک عیسائی عالم اور بشپ تھا اس نے اس خطاب کی مخالفت کی۔ پرستش مریم کے ترقی پذیر رحجان کا اُس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بہت سے عیسائی اس کے پیروکار ہوگئے۔ معاملہ یہاں تک طول پکڑ گیا کہ ایک عیسائی کونسل بلانا پڑی۔ یہ کونسل افیسس(Ephesus) کے مقام پر 431عیسوی میں منعقد ہوئی۔ اس میں مریم کے متعلق Theotokos (یعنی خدا کی ماں) کے خطاب کی توثیق کردی گئی اور نسطوری عقیدہ پر لعنت کی گئی اور نسطوریس (Nestorius) کو جلاوطنی کی سزا ہوئی۔ صاف ظاہر ہے کہ پانچویں صدی کے عیسائی علماء پرستش مریم کے عوامی رحجان کا مقابلہ نہیں کرسکے۔ اس کونسل کے فیصلہ کے بعد یہ رحجان قید وبند سے آزاد ہو کر ایک سیلابِ بلا بن کر بہہ نکلا۔ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت مریم کو آئی سس(Isis) دیوی سے کمتر سمجھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسیح کی طرح مریم کا مرتبہ بھی بڑھانا شروع کردیا۔ اس موقعہ پرRobertson لکھتے ہیں:

> Henceforth, orthodox Christianity was for all practical purposes a worship of a Goddess and two supreme Gods; and Nestorian Christianity, flourishing in Asia,…became a

hostile religion.[1]

مفہوماً ترجمہ: اس وقت سے مروجہ عیسائیت جو کہ عملی طور پر ایک دیوی (یعنی مریم) اور "دو اعلیٰ خداؤں" (یعنی باپ اور بیٹا) کی پرستش گزار بن گئی تھی اور نسطورین عیسائیت جو ایشیا میں پھیل رہی تھی... دو مخالف کیمپوں میں بٹ گئی۔

یعنی نظریاتی تثلیث (باپ، بیٹا اور روح القدس) کے باوجود حضرت مریمؑ کی پرستش پر زور دیا جاتا رہا۔ مریم اور ابن مریم کی یہی معبودانہ زندگی ہے جس کا قرآن حکیم میں ذکر ہوا ہے۔ اس پس منظر میں قرآنی بیان سراسر بصیرت اور ایک عظیم الشان تاریخی حقیقت کا اظہار ہے۔

حرفِ آخر

پس مذکورہ بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ قرآن یا بانی اسلام نے حضرت مریمؑ کو کسی جگہ بھی تثلیث کا اقنوم قرار نہیں دیا بلکہ ان کی عبادت کیے جانے کا ذکر کیا ہے۔ جس کا ثبوت مسیحی تاریخ میں موجود ہے جیسا کہ ابتدائی مسیحی فرقوں میں سے Collyridians کے نام سے ایسے مسیحی فرقے موجود تھے جو ایک دیوی کی طرح حضرت مریم کی عبادت کرتے تھے۔ اور سب سے بڑا مسیحی فرقہ کیتھولک آج بھی اپنے چرچز میں مسیح کے ساتھ حضرت مریم کی تعظیم اسی طرح کرتا ہے جو عبادت میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے دعائیں مانگی جاتی ہیں اسے نجات کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے پس اسی حقیقت کی طرف قرآن نے توجہ دلائی ہے جو عالم الغیب خدا کی طرف سے ہے۔ اب یہ مستشرقین بتائیں کہ کس کو مسیحی عقائد کا علم نہیں۔ ان کو یا بانی اسلام کو۔ اب بتایئے قصور کس کا ہے عیسائیوں کا یا قرآن کا، جس نے دونوں جگہ امر واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ عیسائی تین خدا مانتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اقانیم ثلاثہ میں سے سمجھتے ہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ وہ مسیح اور مریم کو دو معبود بنائے ہوئے ہیں۔ کتنی سچی حقیقت ہے جسے قرآن نے پیش کیا۔ تضاد تو خود عیسائی عقیدہ اور عمل میں ہے لیکن نقص قرآن کا بتایا جاتا ہے۔

[1] J. M. Robertson, *A SHORT HISTORY OF CHRISTIANITY*,1937, WATTS & CO.LONDON, p:111

مظلوم کیفا

(ایم۔ناصر)

اردو کتب میں آپ نے پطرس کا لفظ تو پڑھا ہو گا اور انگریزی تحریرات میں Peter کا لفظ بھی پڑھا ہو گا۔ پطرس اردو میں حضرت مسیح علیہ السلام کے 12 حواریوں میں سے بزرگ ترین حواری کو کہا جاتا ہے اور انگریزی میں Peter استعمال ہوتا ہے جو یونانی لفظ Πετρος سے مأخوذ ہے جس کے معنے ہیں پتھر یا چٹان۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے اس حواری کو اپنی مادری زبان میں جو آرامی کہلاتی ہے ''کیفا''یعنی چٹان کا لقب دیا تھا۔ چنانچہ نئے عہد نامہ میں لکھا ہے:

> ''جب یسوع قیصریہ فلپی کے علاقہ میں آیا تو اس نے اپنے شاگردوں سے یہ پوچھا کہ لوگ ابن آدم (یعنی مسیح) کو کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا بعض یوحنا بپتسمہ دینے والا کہتے ہیں بعض ایلیاہ بعض یرمیاہ یا نبیوں میں سے کوئی۔ اس نے ان سے کہا مگر تم مجھے کیا کہتے ہو؟ شمعون پطرس نے جواب میں کہا تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے۔ یسوع نے جواب میں اس سے کہا مبارک ہے تو شمعون بریوناہ (یوناہ کا بیٹا) کیونکہ یہ بات گوشت اور خون نے نہیں بلکہ میرے باپ نے جو آسمان پر ہے تجھ پر ظاہر کی ہے۔
>
> اور میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو کیفا ہے اور میں اس کیفا پر اپنی کلیسیا بناؤں گا اور عالم ارواح کے دروازے (دوزخ کے دروازے) اس پر غالب نہ آئیں گے۔ میں آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھولے گا۔ اس وقت اس نے شاگردوں کو حکم دیا کہ کسی کو نہ بتانا کہ میں مسیح ہوں۔''

(متی باب 16 آیت 13 تا 20)

اور اس قسم کا مضمون مرقس باب 8 اور لوقا باب 9 میں بھی پایا جاتا ہے۔ نئے عہد نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے مقام کے باوجود جو حضرت مسیحؑ کے ذریعہ شمعون پطرس کو عطا ہوا، ایسے لوگ اٹھے جنہوں نے پطرس کی بھرپور مخالفت کی اور اس پر نہایت ناواجب الزام لگائے۔ چنانچہ متی کے باب 16 میں لکھا ہے کہ یسوع نے پطرس سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے شیطان! میرے سامنے سے دور ہو، تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے۔ کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے۔" (متی باب 16 آیت 23)

حالانکہ اس سے اگلے باب میں حضرت مسیح علیہ السلام ایک اونچے پہاڑ پر تشریف لے گئے اور ان کے ساتھ ان کے صرف 3 حواری تھے جن میں سر فہرست پطرس کا نام ہے اور وہاں وہ اس کشفی نظارے میں بھی حضرت مسیحؑ کے شریک تھے۔ جس میں انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ایلیا علیہ السلام سے ملاقات کی۔ (اگر شیطان والا بیان خدانخواستہ صحیح ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام ان کو اپنے ساتھ اس روحانی تجربہ میں شامل فرماتے)

متی کے باب 19 میں پطرس (کیفا) کے بلند مقام کا اس طرح بھی ذکر ملتا ہے کہ حضرت مسیح ناصریؑ نے ایک موقعہ پر فرمایا:

"اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔ شاگرد یہ سن کر بہت ہی حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پا سکتا ہے؟ یسوع نے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس پر پطرس نے جواب میں اس سے کہا دیکھ ہم تو سب کچھ چھوڑ کر تیرے پیچھے ہو لئے ہیں۔ پس ہم کو کیا ملے گا؟ یسوع نے ان سے کہا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے۔" (متی باب 19 آیت 24 تا 28)

دیکھئے پطرس کی قربانی اور ان کا بلند مقام، لیکن پطرس کے مخالفین چند دن کے بعد ہی ان پر الزام لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گرفتاری کی رات جب یسوع نے اپنے حواریوں کو دعا کرنے کی تاکید کی اور وہ خود بھی یہ دعا کر رہے تھے کہ یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے تو جب وہ شاگردوں کے پاس آئے تو وہ سوئے ہوئے تھے اور انہوں نے پطرس سے کہا کیا تم میرے

ساتھ ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکے۔ (متی باب26 آیت40)

اور پھر یسوع کو گرفتار کیا گیا تو سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (متی باب26 آیت56)

پھر اس سے بڑھ کر جب یسوع پر مقدمہ چلایا جارہا تھا تو مخالفین نے پطرس کو بھی موردِ الزام لانا چاہا تو پطرس نے یسوع کے بارہ میں کہا، لکھا ہے:

"اس پر وہ لعنت کرنے لگا اور قسم کھانے لگا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔" (متی باب26 آیت74)

لیکن اس کے چند دن بعد کی ایک گفتگو یسوع اور پطرس کے درمیان یوحنا کی انجیل باب21 آیت15 تا17 میں درج ہے، لکھا ہے:

"جب کھانا کھا چکے تو یسوع نے شمعون پطرس سے کہا اے شمعون یوحنا کے بیٹے کیا تو ان سے زیادہ مجھ سے محبّت رکھتا ہے؟ اس نے اس سے کہا ہاں خداوند تو تو جانتا ہی ہے کہ میں تجھے عزیز رکھتا ہوں۔ اس نے اس سے کہا۔ تو میرے برّے چرا۔ اس نے دوبارہ اس سے پھر کہا اے شمعون یوحنّا کے بیٹے کیا تو مجھ سے محبّت رکھتا ہے؟ اس نے کہا ہاں خداوند تو تو جانتا ہی ہے کہ میں تجھ کو عزیز رکھتا ہوں۔ اس نے اس سے کہا تو میری بھیڑوں کی گلہ بانی کر۔ اس نے تیسری بار اس سے کہا اے شمعون یوحنّا کے بیٹے کیا تو مجھے عزیز رکھتا ہے؟ چونکہ اس نے تیسری بار اس سے کہا کیا تو مجھے عزیز رکھتا ہے اس سبب سے پطرس نے دلگیر ہو کر اس سے کہا اے خداوند! تو تو سب کچھ جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہی ہے کہ میں تجھے عزیز رکھتا ہوں۔ یسوع نے اس سے کہا تو میری بھیڑیں چرا۔" (یوحنا باب21 آیت15 تا17)

فرمایئے پادری صاحبان کیا یہ فقرات اس پطرس کے ہو سکتے ہیں جس کو یسوع نے شیطان کا لقب دیا۔ جو ایک رات نہ جاگ سکا۔ جو گرفتاری کے وقت چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جس نے مقدمہ کے دوران میں یسوع پر لعنت بھیجی اور کہا میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں مضامین میں ایک مضمون درست ہے۔ یا تو مسیح نے یہ مقام کلیسیا کی چٹان ہونے کا شمعون پطرس کو نہیں دیا اور اگر دیا ہے تو پھر یہ باتیں پطرس کے خلاف کسی دشمن نے ڈالی ہیں۔ اور جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں اس دشمن کا ذکر بھی ہمیں اعمال کی کتاب اور پولوس کے خطوط سے مل جاتا ہے۔

واقعہ صلیب کے بعد اعمال کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شمعون پطرس بالاتفاق سب شاگردوں کا قائد ہے اور اعمال کے باب ایک اور دو میں اس کے قائدانہ مقام کا واضح ذکر ہے۔ باب3 میں پطرس کی نظر سے پیدائشی لنگڑے کے شفا

پانے کا ذکر ہے اور باب 4 میں پطرس کے کلام اور سرگرمیوں کے نتیجہ میں ماننے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کا ذکر ہے اور پطرس کے روح القدس سے معمور ہو کر خطاب کرنے کا ذکر ہے اور باب 5 میں پطرس کے سایہ سے بڑی تعداد میں بیماروں اور معذوروں کے شفا پانے کا ذکر ہے اور پطرس اور اس کے ساتھیوں کی اپنی خدمات کے مقابلہ میں ساؤل (یعنی پولوس) کے کلیسیا کو تباہ کرنے اور گھر گھر گھس کر مردوں، عورتوں کو گھسیٹ کر قید کرانے کا ذکر ہے۔ لیکن پھر اعمال کی کتاب کا انداز آہستہ آہستہ بدل جاتا ہے اور وہ پطرس کے بجائے ساؤل یعنی پولوس کی ہم نوائی کرتی ہے۔

اعمال کی کتاب تسلیم کرتی ہے کہ پطرس واقعہ صلیب کے بعد ماننے والوں کا قائد ہے، اس سے معجزات صادر ہوتے ہیں، مردے زندہ ہوتے ہیں، بیمار شفا پاتے ہیں، معجزانہ طور پر وہ قید خانہ سے نکل آتے ہیں، مگر آہستہ آہستہ ساؤل جو اب اپنا یہودی نام چھوڑ کر پولوس کا رومی نام استعمال کرتا ہے اور غالباً کسی تدبیر سے رومی قومیت بھی حاصل کر لیتا ہے، کا غلبہ شروع ہو جاتا ہے اور جب حضرت مسیح کے بنی اسرائیلی متبع اس کی سر عام مخالفت کرتے ہیں تو وہ یونانی اقوام میں تبلیغ کرتا ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح نے صاف فرما دیا تھا کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ مگر جب پولوس کی ظلم و ستم کر کے عیسائیت کو ختم کرنے کی کوششیں ناکام ہوئیں تو اس نے عیسائیت کا جامہ پہن کر عیسائیت میں بگاڑ پیدا کرنا شروع کیا اور یہ نظریہ پھیلانا شروع کیا کہ غیر بنی اسرائیلی بھی یسوع کے پیغام کے مخاطب ہیں اور یہودی شریعت پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ اس پر بزرگوں کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں پولوس کے ہم نواؤں کے بقول اس مجلس میں حضرت مسیح کے بھائی یعقوب نے فیصلہ فرمایا کہ اگر کوئی غیر اسرائیلی مسیحیت میں آنا چاہے تو شریعت موسوی کے بعض بنیادی امور کے علاوہ اس کے لئے موسوی شریعت کی تفاصیل واجب العمل نہ ہونگی۔ (اعمال باب 15)

لیکن یہ مدّ نظر رہے کہ اس بیان کے راوی پولوس کے زیر سایہ لکھنے والے ہیں اور اعمال کی کتاب کے 15 باب میں یہ بھی بیان ہے کہ پولوس اور اس کے خاص رفیق کار برنباس میں سخت تکرار ہوئی اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگرچہ وضاحت سے یہ نہیں لکھا گیا کہ اس تکرار اور جدائی کا باعث کیا تھا مگر معلوم یہی ہوتا ہے کہ پولوس نے جب حضرت مسیح کی تعلیم کے برخلاف موسوی شریعت کو منسوخ قرار دیا تو برنباس اس سے الگ ہو گئے اور اب آہستہ آہستہ پولوس جو صریحاً حضرت مسیح کی تعلیم کے خلاف عمل کر رہا تھا علی الاعلان پطرس کی، جس کو حضرت مسیح نے کلیسیاء کی بنیادی چٹان قرار دیا تھا مخالفت کرنے لگا اور ان کو بدنام کرنے کے لئے ان پر الزامات لگانے لگا۔ چنانچہ پولوس اپنے

گلتیوں کے خط میں لکھتا ہے:

"جب کیفا انطاکیہ میں آیا تو میں نے روبرو ہو کر اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ ملامت کے لائق تھا۔ اس لئے کہ یعقوب کی طرف سے چند شخصوں کے آنے سے پہلے تو وہ غیر قوم والوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا مگر جب وہ آگئے تو مختونوں سے ڈر کر باز رہا اور کنارہ کیا۔ اور باقی یہودیوں نے بھی اس کے ساتھ ہو کر ریاکاری کی۔ یہاں تک کہ برنباس بھی ان کے ساتھ ریاکاری میں پڑ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ خوشخبری کی سچائی کے موافق سیدھی چال نہیں چلتے تو میں نے سب کے سامنے کیفا سے کہا کہ جب تو باوجود یہودی ہونے کے غیر قوموں کی طرح زندگی گذارتا ہے نہ کہ یہودیوں کی طرح تو غیر قوموں کو یہودیوں کی طرح چلنے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟" (گلتیوں باب 2 آیت 11 تا 14)

پطرس اور اس کے ساتھی یسوع کے شاگرد جو حضرت مسیح نے اپنے ہاتھ سے تیار کئے اور ان کو خود براہ راست تعلیم دی اور ان کی تربیت کی ان کے بارہ میں پولوس لکھتا ہے:

"میں تو اپنے آپ کو ان افضل رسولوں سے کچھ کم نہیں سمجھتا اگر تقریر میں بے شعور ہوں تو علم کے اعتبار سے تو نہیں بلکہ ہم نے اس کو ہر بات میں تمام آدمیوں پر تمہاری خاطر ظاہر کر دیا۔"
(کرنتھیوں باب 11 آیت 5)

اس خط میں پولوس حضرت مسیح کے شاگردوں کے متعلق یہ بھی اشارہ کرتا ہے، لکھتا ہے:

"ایسے لوگ جھوٹے رسول اور دغابازی سے کام کرنے والے ہیں اور اپنے آپ کو مسیح کے رسولوں کے ہم شکل بنالیتے ہیں اور کچھ عجب نہیں کیونکہ شیطان بھی اپنے آپ کو نورانی فرشتہ کا ہم شکل بنالیتا ہے۔" (کرنتھیوں باب 11 آیت 13)

پولوس نے خود اقرار کیا ہے کہ وہ مسیح کا سخت دشمن تھا مگر اس کا دعویٰ ہے کہ مسیح نے مکاشفہ کے ذریعہ اس کو تعلیم دی۔ یہ اس کا ایک دعویٰ ہے جس کا اس نے کوئی ثبوت نہیں دیا، وہ لکھتا ہے:

"اے بھائیو! میں تمہیں جتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری میں نے سنائی وہ انسان کی سی نہیں۔ کیونکہ وہ مجھے انسان کی طرف سے نہیں پہنچی اور نہ مجھے سکھائی گئی بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اس کا مکاشفہ ہوا۔ چنانچہ یہودی طریق میں جو پہلے میرا چال چلن تھا تم سن چکے ہو کہ میں خدا کی کلیسیا کو از حد ستاتا اور تباہ کرتا تھا۔ اور میں یہودی طریق

میں اپنی قوم کے اکثر ہم عمروں سے بڑھتا جاتا تھا اور اپنے بزرگوں کی روایتوں میں نہایت سرگرم تھا۔ لیکن جس خدا نے مجھے میری ماں کے پیٹ ہی سے مخصوص کر لیا اور اپنے فضل سے بلا لیا جب اس کی یہ مرضی ہوئی۔ کہ اپنے بیٹے کو مجھے میں ظاہر کرے تاکہ میں غیر قوموں میں اس کی خوشخبری دوں تو نہ میں نے گوشت اور خون سے صلاح لی۔ اور نہ یروشلیم میں ان کے پاس گیا جو مجھ سے پہلے رسول تھے بلکہ فوراً عرب کو چلا گیا۔ پھر وہاں سے دمشق کو واپس آیا۔ پھر تین برس کے بعد میں کیفا سے ملاقات کرنے کو یروشلیم گیا اور پندرہ دن اس کے پاس رہا۔ مگر اور رسولوں میں سے خداوند کے بھائی یعقوب کے سوا کسی سے نہ ملا۔" (گلتیوں باب 1 آیت 11 تا 19)

صاف ظاہر ہے کہ پولوس نے یسوع کی تعلیم نہ یسوع سے سیکھی نہ یسوع سے سیکھنے والے شاگردوں سے بلکہ ایک مکاشفہ کی بناء پر جو جھوٹا بھی ہو سکتا ہے ایک نیا مذہب تراشا جو حضرت مسیح اور ان کے اوّل درجہ کے شاگردوں کی تعلیمات سے بالکل مختلف تھا۔ پولوس نے حضرت مسیح کے لئے لعنتی کا لفظ استعمال کیا۔ (نعوذ باللہ) (گلتیوں باب 3 آیت 13)

اور پطرس جو حضرت مسیح کو سب سے بڑھ کر عزیز تھا یہ الزام لگایا، لکھتا ہے:

"جو میرا امتحان کر رہے ہیں ان کے لئے میرا یہی جواب ہے کیا ہمیں کھانے پینے کا اختیار نہیں؟ کیا ہم کو یہ اختیار نہیں کہ کسی مسیحی بہن کو بیاہ کر لئے پھریں جیسے اور رسول اور خداوند کے بھائی اور کیفا کرتے ہیں۔" (کرنتھیوں باب 9 آیت 3 تا 5)

پطرس جو حضرت مسیح کے تربیت یافتہ تھے انہوں نے پولوس کی زیادتیوں پر جو تحمل اختیار کیا اس کا نمونہ یہ ہے کہ وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"ہمارے پیارے بھائی پولوس نے بھی اس حکمت کے موافق جو اسے دی گئی تمہیں لکھا ہے اور تمام خطوط میں ان باتوں کا ذکر کیا ہے ان میں بعض باتیں ہیں جن کا سمجھنا مشکل ہے اور جو جاہل اور بے قیام ہیں وہ ان کے معنوں کو دوسرے نوشتوں کی طرح اپنی ہلاکت کے لئے بگاڑتے ہیں۔"

(2 پطرس باب 3 آیت 16,15)

ردّ دہریت

ایک معروف دہریہ Richard Dawkins کے اعتراضات کے جواب

(وسیمہ اُپل (آسٹریلیا) بنت پروفیسر چوہدری رحمت علی مسلم)

گزشتہ چار شماروں سے مشہور دہریہ مصنف رچرڈ ڈاکنز کی کتاب "The God Delusion" کے حوالہ سے بعض حقائق کو پیش کیا جا رہا ہے جس سے اس کتاب کے مندرجات کی نفی ہوتی ہے۔ چنانچہ گزشتہ شمارہ میں قارئین کے سامنے قرآن مجید کی ان مختلف آیات کا حوالہ دیا گیا تھا جو کائنات کے آغاز اور اختتام سے متعلق ہیں اور دکھایا گیا تھا کہ کس طرح آج سائنس اپنی جدید ترین تحقیقات سے جو حقائق ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے آج سے 1500 سال قبل یہ باتیں قرآن مجید میں پہلے سے درج تھیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ خالق کائنات جو ان تمام رازوں کا واقف تھا جو اس کائنات میں پنہاں تھے، اسی نے اپنے کامل علم اور کامل قدرت سے اس کتاب یعنی قرآن مجید کو اتارا ہے۔ گزشتہ شمارہ میں قرآن مجید کی آیت اَللّٰہُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ۔(الروم:12)اللہ خَلق کا آغاز کرتا ہے پھر اُسے دوہراتا ہے پھر اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے، کے حوالہ سے کائنات کے Cyclic Model کے حوالہ سے بات ہو رہی تھی اور اس حوالہ سے یہ بیان کیا گیا تھا کہ Dark Energy کی دریافت اس کو سمجھنے کے لئے کتنی اہم ہے۔

کائنات کی تخلیق اور ایک ہی کامل Designer

Dark Energy

Dark Energy کے بارے میں یہ بہت بڑی دریافت تھی کہ کائنات میں exploding stars اور ان کی galaxies کی رفتار میں اس کی وجہ سے مسلسل تیزی آتی جا رہی ہے کیونکہ یہ نامعلوم طاقت جسے Dark Energy کے

نام سے ہم جانتے ہیں، ہماری کائنات کا کل 70 فیصد سے زائد ہے اور largest scale پر کائنات پر محیط ہونے کی وجہ سے اس پر سب سے زیادہ اثر انداز ہے۔ کائنات کو یہی طاقت تیز تر، کر رہی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ(الذاریات:48) یعنی یقیناً ہم اسے وسعت دیتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ وسعت اس طاقت کے ذریعہ سے دی جا رہی ہے۔ سائنسدان اس طاقت کے بارہ میں ابھی کچھ بھی مزید نہیں جانتے لیکن وہ یہ confirm کر رہے ہیں کہ:

It is the Most Powerful.

It is the Boss of the Universe.

It is the Controller of the Universe.

It is the Most Important Component of the Universe.

It has been there working in the shadows for billions and billions and billions of years.

امریکی Astrophysicist۔ Neil de Grasse Tyson نے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا کہ Dark Energy جو 1998ء میں دریافت ہوئی یہ بہت بڑی Mystery ہے جس کا تعلق پوری کائنات کو control کرنے سے ہے اور اسی سے کائنات کا expansion ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس سے کوئی سائنس دان آج تک پردہ نہیں اٹھا سکا۔ لیکن یہ موجود ہے اور اس بارے میں کسی کو شک نہیں۔

سائنس دانوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ ابتدا سے ایسے ہی ہے اور اسی کی وجہ سے gravity نے galaxies کو پکڑ رکھا ہے۔ جب کائنات بنی تو اسی کی وجہ سے تمام قوتیں اور مادہ وجود میں آیا۔ لیکن سائنسدان ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ یہ کس طرح matter کے ساتھ interact کرتی ہے۔ وہ جتنی بھی تحقیق کرتے ہیں اتنے ہی ششدر (bewildered) رہ جاتے ہیں۔ ان کے آلات۔ telescopes, observatories, space stations اور Nuclear Space Missions اسی کام میں لگے ہوئے ہیں اور کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہر سائنس دان تسلیم کرتا ہے کہ ہمیں اس بارے میں ابھی بہت زیادہ علم حاصل کرنا ہے۔ یہی تو اللہ فرما رہا ہے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے کہ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (البقرۃ:256) وہ اس کے علم کا کچھ بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کی بادشاہت آسمانوں اور زمین پر ممتد ہے۔

جب پیرس کی Sorbonne University کے Astrophysicist کے پروفیسر Benjamin D. Wandelt سے ایک حالیہ انٹرویو میں ایک فزکس کے ماہر Astrophysicist۔ Paul Sutter نے پوچھا کہ Dark Energy کے بارے میں جاننے میں کتنا عرصہ لگے گا تو اس نے کہا اس کے لئے ہمیں بہت بہت آگے جانا ہے کم از کم تیس چالیس سال تو لگیں گے کہ شاید ہم یہ جان سکیں کہ کائنات کی expansion کیسے ہو رہی ہے مگر کائنات کا infinite لامتناہی مستقبل ہے۔

Infinite volume.
Infinite space.
Infinite time.

جب کائنات کا مستقبل ہی infinite ہے تو یہ cycle پھر سے شروع ہو جائے گا یعنی New beginning بس دیکھیں کیسے ان سائنسدانوں کے یہ بیانات اس آیت کی تصدیق کر رہے ہیں کہ اَللّٰہُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ (الروم: 12) اللہ ہی وہ ذات ہے جو تخلیق کو شروع کرتا اور دہراتا ہے۔

پس سائنس دان اپنی تمام تر تحقیقات اور دریافتوں کے بعد وہی کہہ رہے جو قرآن مجید میں خالق کائنات نے خود بتا دیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ:

اسرار ازل را نہ تو دانی ونہ من　　　ویں حرف معمانہ تو خوانی ونہ من
ہست از پس پردہ گفتگوی من وتو　　　چوں پردہ برافتد نہ تومانی ونہ من

یعنی ازل کے اسرار نہ تم جانتے ہو اور نہ میں، یہ سربستہ راز نہ تم پڑھ سکتے ہو اور نہ میں۔ میرے اور تمہارے درمیان پردے کے پیچھے ایک گفتگو جاری ہے، جب یہ پردہ ہٹ جائے گا، نہ تم باقی رہو گے اور نہ میں۔

Gravitational Waves

کائنات کے متعلق جو بھی تحقیق ہو رہی ہے وہ خالق کائنات کا وجود ہی ثابت کرتی نظر آتی ہے اور اس کی وحدانیت کے بارے میں ہی اشارے کرتی ہے یہی پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام صاحب نے بھی اس وقت کہا تھا جب ان کی تحقیق پر ان کو نوبل انعام ملا تھا کہ کائنات میں قدرت کی چار forces کام کر رہی ہیں آئن سٹائن یہی چاہتا تھا کہ ان forces کو متحد کرے (unification) اور پروفیسر عبد السلام صاحب نے دو forces کو unite کیا اور کہا کہ دو اور کے بارے میں میں نے

اور Dr. Pati نے prediction کر دی ہے کہ وہ بھی unite ہوں گی اور آخر میں ثابت ہو گا کہ چاروں forces دراصل ایک ہی Force ہے یعنی Grand Unification Theory اور یہی چیز درحقیقت توحید کو ثابت کرے گی۔

Gravity ایک ایسی ہی Force ہے جس کے بارے میں اب بہت تحقیق ہو رہی ہے کیونکہ آخر اسی میں باقی تینوں forces نے اکٹھے ہونا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے سر آئزک نیوٹن نے ایک equation بنائی اور یہ حقیقت دنیا پر واضح کی کہ gravity جیسے زمین پر کام کر رہی ہے ویسے ہی باقی کائنات میں بھی کام کر رہی ہے۔ اس کے بعد آج سے سو سال قبل آئن سٹائن نے بھی gravity کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا یعنی یہ کہ جو بہت massive objects ہیں ان کے mass اور energy کی وجہ سے time space کے fabric میں جو سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے وہ لہروں کی طرح ہے جس طرح پانی کے تالاب میں پتھر پھینکنے سے لہریں بنتی ہیں۔

آئن سٹائن کے اس نظریے کو سو سال بعد 2015ء میں دیکھا گیا اور محسوس کیا گیا کہ جب 2015ء میں زمین پر وہ waves پہنچیں جنہیں LIGO سسٹم نے detect کیا۔ یہ لہریں (waves) دراصل ایک ایسے واقعہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی لہریں تھیں جو 2015ء سے قریب 1.3 بلین سال پہلے ہوا (یعنی Big Bang) کے 12 بلین سال بعد۔ چنانچہ اتنا عرصہ سفر کر کے یہ لہریں ہماری زمین تک پہنچیں۔ آئن سٹائن کو پہلے سے اس بات کی سمجھ تھی کہ gravity کا اثر ایک wave یعنی لہر کی طرح ہے اور 2015ء کے بعد 2016ء میں بھی امریکہ میں سائنس دانوں نے ایک ہی وقت میں دو مختلف جگہوں پر اس force of gravity کو detect کر لیا کہ دو بہت بڑے ستاروں کے ملنے سے جب ایک بلیک ہول بنا تو اس کے نتیجہ میں جو force اس سے پیدا ہوئی یعنی gravity اس کے نتیجہ میں کائنات کے fabric میں distortion ہوئی اور پھر وہ distortion ایک wave کی شکل میں روشنی کی رفتار سے کائنات میں پھیل گئی۔

اور اگرچہ یہ لہر روشنی کی رفتار سے کائنات کے طول و عرض میں پھیلی لیکن یہ اتنی دور سے اسی رفتار سے سفر کرتے ہوئے بھی قریب 1،300،000،000 سال بعد ہماری زمین تک پہنچ سکیں۔ اس واقعہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی Gravitational Force کی شدت تو بہت زیادہ ہو گی لیکن بہت زیادہ دور ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے مشکل تھا کہ اس کو detect کر سکتے۔ چنانچہ اس کام کے لئے Laser کا استعمال کیا۔ 2017ء میں اس project پر کام کرنے والوں میں سے تین افراد کو فزکس کا نوبل انعام دیا گیا۔ ان سائنسدانوں نے بتایا کہ gravitational waves کے مطالعہ سے

کائنات کے وسیع ہونے کے عمل کو اور Dark Energy کو جو اس پر اثر انداز ہو رہی ہے مزید سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ نیز ابتدائی کائنات کے حالات (Earliest History of the Universe) کا علم بھی ہو سکے گا۔

Perfect and Fine Tuned Universe

اب مختصراً ہم اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ Big Bang کے بعد حالات کیسے موزوں ہوئے کون کون سے factors تھے اور کس طرح کی set conditions اور limitations تھیں جن کی وجہ سے ایسی متوازن اور متناسب کائنات وجود میں آئی جس کے نتیجے میں ایک باشعور ہستی یعنی انسان کا بننا مقصود تھا۔

1973ء میں آسٹریلیا کے ماہر فزکس Brandon Carter نے Copernicus کی یاد میں 500 سالہ کانفرنس میں کہا کہ انسان یقیناً بہت اہم ہے۔ ہم جو اس کرۂ ارض پر ہیں اس کے لئے کروڑوں سال قبل ہائیڈروجن کا ستاروں میں بننا ضروری تھا۔ مثلاً وہ مقررہ تعداد جن سے کائنات میں ہر step ہو سکتا جیسے کہ forces کی strength کتنی ہو۔ particals کا mass کتنا ہو کہ اگلا step ہو سکے۔ Quantum Mechanies کیا کام کر رہی تھی Planck's Constant کیا تھا؟ Gravitational constant کی کیا اہمیت تھی؟ کن حالات میں بہت ہی زیادہ چھوٹے ذرات quarks جڑ سکتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ قدرت نے خود یہ اصول وضع کئے تھے نہ کہ کسی سائنس دان کے دماغ یا حسابات نے۔ ان مقررہ قوانین کا ذرہ برابر بھی ادھر ادھر ہونا خطرناک نتائج پیدا کر سکتا تھا۔

تقریباً 14 بلین سال قبل چار بنیادی forces تھیں۔

Electromagnetic forces

Gravitational force

Weak nuclear force

Strong nuclear force

ان forces نے کچھ اس توازن اور ترتیب سے کام کیا جس کے نتیجہ میں وہ elements بنے جن کا حتمی نتیجہ ستاروں، کہکشاؤں اور سیاروں کی تخلیق تھی۔ اگر gravity کی قوت ذرہ سی بھی زیادہ ہو جاتی یا Electromagnetic force معمولی سی بھی کمزور پڑ جاتی تو یہ کائنات کبھی بھی ایسی نہ ہوتی۔ اور نہ ہی انسان کا وجود ہوتا کیونکہ زندگی ہی نہ بن پاتی۔ ابھی تک سائنس دان یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ قوانین قدرت کیسے اتنے perfect تھے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ

ایک مدبر بالارادہ ہستی ہے جو ان تمام چیزوں کو جانتی ہے۔ جس کے دست قدرت سے ہی ایسی کامل چیز وجود میں آسکتی ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی ذی شعور مخلوق کو یہ دعوت دے کہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرُۨ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾ (الملک:1تا5)

اللہ کے نام کے ساتھ جو بے انتہا رحم کرنے والا، بن مانگے دینے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ بس ایک وہی برکت والا ثابت ہوا جس کے قبضۂ قدرت میں تمام بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر جسے وہ چاہے دائمی قدرت رکھتا ہے۔ وہی جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہترین ہے۔ اور وہ کامل غلبہ والا (اور) بہت بخشنے والا ہے۔ وہی جس نے سات آسمانوں کو طبقہ در طبقہ پیدا کیا۔ تُو رحمان کی تخلیق میں کوئی تضاد نہیں دیکھتا۔ پس نظر دوڑا۔ کیا تو کوئی رخنہ دیکھ سکتا ہے؟ نظر پھر دوسری مرتبہ دوڑا، تیری طرف نظر ناکام لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہاری ہو گی۔

Anthropic Principle

کائنات کی تخلیق میں جہاں اور بہت سے حیرت انگیز عوامل کارفرما تھے وہیں Big Bang کے بعد اس تمام عمل کی cooling ہونی بھی بہت ضروری تھی۔ چنانچہ اس ضرورت کے پورا ہونے کے لئے ہماری کائنات expand ہونے لگی اور اس کی ایک بڑی fixed رفتار تھی اور تیزی (acceleration) بھی بڑے منظم rate سے ہو رہی تھی یعنی نہ کم اور نہ زیادہ بلکہ یہ سارا عمل ایک خاص توازن میں ہو رہا تھا اور ایسے ہو رہا تھا جیسے اسے بہت خاص انداز سے کنٹرول کیا جارہا ہو۔ اگر یہ رفتار critical rate سے کم ہو جاتی تو جو sub atomic particales بن رہے تھے وہ اپنے اوپر ہی collapse کر جاتے یعنی ایک دوسرے میں گر کر ختم ہو جاتے اور اگر یہ رفتار critical rate سے تیز ہو جاتی تو جو particales بن رہے تھے وہ ایک دوسرے سے بکھر کر دور ہو جاتے اور نہ ستارے بنتے اور نہ galaxies نہ matter اور نہ ہی یہ زندگی وجود میں آتی۔

اس لئے شروع سے ہی cosmic radiation کے ایک خاص رفتار سے پھیل جانے کی وجہ سے درجہ حرارت آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور ایک بڑا توازن قائم ہونا شروع ہو گیا۔ اسی حقیقت کو Brandon Carter نے پیش کیا جس میں ان چاروں forces میں ایک بڑا delicate balance بتایا جس balance کے نتیجے میں شعاؤں کا وہ cycle چلنا تھا جنھوں نے elements بنانے تھے۔ اس لئے اس توازن میں معمولی سی تبدیلی بھی سب کچھ تباہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ شروع سے ہی ایک بڑی precision اور accuracy تھی اور بڑی درستگی اور perfection سے اس کائنات کی تخلیق ہوئی۔ لیکن افسوس کہ سائنس کو پوجنے والے لوگ ان تمام حقائق کو جاننے کے باوجود اس کے واضح ترین نتیجہ سے اتفاق نہیں کر پاتے۔

آنکھ کے اندھوں کو حائل ہو گئے سو سو حجاب ورنہ قبلہ تھا ترا رخ کافر و دیندار کا

یہ چاروں forces کا توازن، خوبصورت ترین توازن ہی تھا جو انتہائی Finely Tuned تھا اور پھر اسی عمل کے نتیجہ میں ستاروں میں وہ عمل ہوا کہ جس سے سارا matter بنا۔ ستاروں میں جو hydrogen اور helium بننے کا process تھا اس سے اگر وہاں oxygen بنتی تو ساری oxygen جل کر ختم ہو جاتی اور پانی نہ بن پاتا جو زمین پر زندگی (cell) بنانے کے لئے ضروری تھا۔ پھر پانی کو دیکھیں تو وہ بھی اتنی زیادہ مقدار میں تھا کہ اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ آج زمین کا زیادہ حصہ پانی ہے اور بہت بہت گہرائی تک پانی ہے۔ یعنی وہ گہرائی جو سمندروں میں دیکھی جاتی ہے اور اگر انسان سوچے تو ششدر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کائنات میں کاربن (C) بننا بہت ضروری تھا جس سے زندگی (cell) کے بننے کے building blocks نے بننا تھا۔ ان heavy metals کا بننا بھی کسی معجزہ سے کم نہیں۔ یہی وہ محیر العقول معجزات ہیں جو دراصل خالق کی موجودگی کے بیّن ثبوت ہیں جو ایک مدبر اور قادر اور قیوم خدا ہے۔

آج سائنس دان مانتے ہیں کہ ابتداء میں ستاروں میں وہ ضروری elements بنے ہوں گے جو زندگی کی پیدائش کے لئے ضروری تھے اور یہ عمل کروڑوں سال تک ہوتا رہا ہو گا اس لئے ہمیں جو کائنات کا اتنا بڑا اور vast pool نظر آتا ہے وہ بڑا ضروری تھا کیونکہ یہ عمل آہستہ آہستہ اور بہت لمبے عرصے پر محیط تھا(billions and billions of years) اس لئے آپ جب رات کو باہر آکر آسمان کو دیکھیں تو appriciate کریں اور کہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۔ ۔ ۔ (آل عمران: 192) یہ کوئی ایسے ہی خود بخود ہو جانے والا یا بے ترتیب عمل نہ تھا

اور نہ ہی ڈارون یا ڈاکنز کے Blind principle کے تحت ہونے والا کوئی کام، بلکہ یہ ایک Anthropic Principle تھا اور اسی لئے ہماری کائنات اتنی خوبصورت اور perfect بننے کے قابل ہو سکی ہے۔

پھر ایک طرف تو آغاز اور ابتداء کا محیر العقول معجزہ ہے جہاں اوپر درج کئے گئے ابلغ اور محکم نظام کار فرما نظر آتے ہیں اور پھر کمال یہ ہے کہ وہی قوانین جو کائنات بنانے کے لئے ضروری تھے اور کار فرما نظر آئے تھے وہی زمین پر بھی اتنی diversity اور خوبصورت زندگی بنانے کے لئے کار فرما ہوئے۔ چنانچہ البیرونی اور گلیلیو جیسے ذہین سائنس دانوں نے بھی یہی کہا تھا اور پھر نیوٹن جیسے ذہین سائنس دان نے حساب (maths) کی بنیاد پر یعنی equation اور calculation سے اسی اصول کو ثابت بھی کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام نے بھی یہی کہا کہ جو force زمین پر زندگی کو قائم رکھے ہوئے ہے وہی کائنات میں تمام ستاروں اور سیاروں کو اپنی اپنی جگہ پر اور مدار پر قائم رکھتی ہے اور اسی لئے دونوں میں بڑی مطابقت ہے۔

Big Bang کے بعد شروع ہونے والی expansion اور cooling کے نتیجے میں مختلف چیزوں کا ایک خاص تعلق بنا اور جب ایک critical پوائنٹ آیا تو sub atomic particles (quarks) بننے شروع ہو گئے اور انہوں نے strong nuclear force کی وجہ سے ایٹم کا nucleus یا مرکزہ بنایا۔ اور پھر اس مرکز کے باہر electrons ایک دوسری nuclear force کی وجہ سے ایک point پر (جس کو critical value کہتے ہیں) گھومنے لگے یہ دونوں forces بقول پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام ایک ہی force کے دو[2] رخ ہیں۔

تخلیق کائنات کے اس مرحلہ پر یہ Fine Tuning ایسی ضروری تھی جو پروفیسر عبد السلام نے بتایا کہ اگر Nuclear force اور Electromagnetic force میں مطابقت نہ ہوتی اور ذرہ سی بھی variation آ جاتی تو کائنات کی حالت پر خطرناک اثرات ہوتے۔ hydrogen نہ بن پاتی اور نہ ہی پانی بنتا اور ظاہر ہے کہ اگر پانی نہیں بنتا تو زندگی بھی وجود میں نہ آتی۔ اس لئے Big Bang کے بعد یہ ایک بہت ہی اہم process تھا۔ اسی لئے اس کی طرف قرآن کی وہ آیت اشارہ کر رہی ہے جس میں Big Bang کا ذکر ہے فَفَتَقْنٰهُمَا... اور اس کے بعد فرمایا: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۔(الانبیاء: 31)

تمام Biological اور biochemical عوامل (reactions) کے لئے پانی بڑا ضروری تھا اسی لئے پانی بننے کا process اوپر کائنات میں ہی ہوا اور آج بھی جو پتھر جیسے Asteroid Murchison جو 1969ء میں گرا تھا وہ 4.65

بلین سال پرانا تھا اس میں بے شمار (C) کاربن والے organic compounds کے علاوہ پانی کے molecules بھی تھے۔

پھر کائنات کا وسیع ہونا اور ہوتے چلے جانا بھی ایک عظیم معجزہ ہے۔ ستارے تبھی بنتے ہیں جب space ہو جہاں ان سے نکلنے والی heat اور light اکٹھی ہو سکے۔ Big Bang کے بعد اگر کائنات وسیع نہ ہوتی تو ستارے بننے کے لئے جگہ ہی نہ ہوتی۔ اسی طرح ایک ایٹم کے بننے کے لئے بھی gravitational طاقت کا باہر نکلنا ضروری تھا جو Big Bang یعنی Great explosion کا نتیجہ تھا جس کا وقت سائنس دان تو 13.8 بلین سال قبل بتاتے ہیں مگر پروفیسر عبدالسلام کے مطابق کم از کم 15 بلین سال قبل یہ واقعہ ہوا۔

فزکس کے ماہرین Bernard J.Carr اور Martin J. Rees نے 1979ء میں بھی کائنات کی Fine Tuning کی بات کی اور کہا کہ اگر اس توازن میں یا عمل میں جو Big Bang کے بعد ہوا، کوئی معمولی سے بھی کمی بیشی ہوتی تو ہماری کائنات کی evolution نہ ہو پاتی اور نہ ہی زندگی وجود میں آتی۔

پھر اگر رات نہ ہوتی تو سائنس دانوں کو وسیع ہوتی ہوئی کائنات کا علم ہی نہ ہوتا اسی کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۚۙ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (آل عمران: 191، 192)

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادلنے بدلنے میں صاحبِ عقل لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے بھی اور بیٹھے ہوئے بھی اور اپنے پہلوؤں کے بل بھی اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ (اور بے ساختہ کہتے ہیں) اے ہمارے ربّ! تُو نے ہرگز یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ پاک ہے تُو۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

جس عمل سے کائنات میں مختلف elements بنتے تھے اس کے لئے ایک lowest possible state چاہیئے تھی اگر یہ عمل اس lowest state سے پہلے ہی، helium کے بنتے ہی رُک جاتا تو ستاروں میں صرف hydrogen اور helium ہی بن پاتی کیونکہ ستاروں میں عموماً یہی دو elements ہوتے ہیں چنانچہ ہمارے سورج میں بھی ان دو سے آگے کوئی element نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری کائنات میں صرف ستارے ہی ہوتے اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ستاروں کا بننا standard Cosmological laws کے تحت ہوا۔ جب وہ ایک خاص سائز سے بڑے ہوئے تو explode کر گئے۔ چنانچہ ان میں اب صرف hydrogen اور helium ہی نہ تھی بلکہ پانی (H^2O) اور carbon کے مرکبات جیسے CH_2 اور نائٹروجن کے مرکبات NH_3 کے علاوہ مٹی کے ذرات جن میں لوہا اور میگنیشیم تھا اور مزید complex مرکبات بھی بن چکے تھے، یہ وہ مرکبات تھے جن سے اب زندگی کی پیدائش ہونی تھی۔

پھر بعد میں انہی ستاروں نے planets بنائے۔ پھر ہماری زمین پر پانی اوپر کائنات سے آیا جس طرح زندگی کی پیدائش کے لئے جو building blocks چاہئے تھے وہ بھی اوپر کائنات سے ہی آئے۔

یہ اور اس جیسے بہت سے قوانین قدرت پہلے سے ہی ہماری کائنات میں کام کر رہے تھے اب ان کو انسان نے معلوم کیا ہے اور تجربات سے ثابت کیا ہے۔

پس چاروں بنیادی طاقتوں کا نہ صرف کائنات کو بنانے میں بہت بڑا role تھا بلکہ ان کے خوبصورت ترین توازن نے بھی کائنات کے بننے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اسی کو Fine Tuned کہتے ہیں اور اسی سے matter بنا۔

قوانین قدرت جو Big Bang کے وقت سے کام کر رہے ہیں آج بھی اسی طرح مصروف عمل ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور یہ ہمارے ارد گرد بھی اسی طرح کام کر رہے ہیں اور اس طرح انہوں نے ہماری کائنات کو stable رکھا ہوا ہے۔ اگر ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں آسمان کو غور سے دیکھیں تو ہمیں کوئی رخنہ یا کمی نظر نہیں آئے گی جبکہ اگر زمین پر غور کریں تو اس زمین پر بھی زندگی میں ایک زبردست توازن ہے کیونکہ چاروں fundamental forces نے آج بھی balance کو اپنے اندر برقرار رکھا ہوا ہے۔

اگر nuclear forces ذرا سی بھی تبدیل ہو جائیں تو بہت جلد یعنی within a second خطرناک تباہی آسکتی ہے۔ جس ذات نے ان طاقتوں کو پیدا کیا، اسی نے چھوٹے ترین level پر بھی ان کو stable رکھا ہوا ہے۔ آج بھی روشنی کی رفتار وہی ہے جو ابتدائے کائنات سے تھی۔ آج بھی وہ forces جو strong اور weak ہیں اور وہ forces جو electromagnetic ہیں اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔

مزید ستارے بن رہے ہیں، galaxies بن رہی ہیں، Black holes بن رہے ہیں۔ اس سے یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ کوئی بڑی خاص طاقت آج بھی کائنات میں کام کر رہی ہے اور اس کو control کر رہی ہے اور اس اتنی بڑی کائنات

میں ہمارا، جو زندہ انسان ہیں، اس کائنات کی ایک رونق ہیں، کوئی نہ کوئی مقصد ہے اور کائنات بھی بلا مقصد نہیں۔

ہم جب غور کرتے ہیں اور سوچتے ہیں تو یہی سچائی معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح کائنات میں perfection ہے اور اس کرہ ارض میں perfection ہے اس کا نہ صرف ایک Designer ہے بلکہ ایک Supreme Creator یعنی خالق ہے اور Fine Tuning بھی اسی لئے ہے کہ ایک Fine Tuner ہے۔ یہ Tuning ثابت کرتی ہے کہ خدا ایک ہی ہے جو اسے چلا رہا ہے۔

سائنس دان مانتے ہیں کہ کائنات میں شروع سے ہی کچھ اصول تھے۔ وہ forces جو بنیادی ہیں انہوں نے بڑا systematically کام شروع کیا اور quarks بنائے جو ایک ایٹم کے بننے کے لئے بنیادی اکائی تھی ان سے پھر ایٹم کا nucleus بنا جس میں سے proton میں دو upquark تھے اور ایک down quark اور neutron میں ایک up اور دو down یہ ممکن ہی نہ تھا کہ نمبر کے لحاظ سے یا ترتیب کے لحاظ سے کچھ بھی ملنا شروع ہو جاتا اور پھر ڈارون کا یا ڈاکنز کا اصول survival of the fittest ہوتا۔ شروع سے ہی سب کچھ ٹھیک ہی بنا نہ کہ بہت کچھ میں سے صرف صحیح کی selection ہو گئی اور باقی کو discard کر دیا گیا۔ شروع میں ہی ستارے بننے کے لئے جو جو چاہیئے تھا وہ سب مہیا ہوا اور یہ سب جو مہیا ہوا اس کا بھی ہر step بہت درست طریقے سے عمل پذیر تھا۔

سائنس دانوں نے ثابت کیا ہے کہ quarks بننے اور جڑنے کا یہ نازک ترین اور درست ترین توازن ہی تھا جس کے نتیجہ میں شروع میں protons ہی بنے تا کہ hydrogen بن سکے پھر ستارے بنیں جن میں پھر وہ عمل ہو جن سے وہ heavy elements بنیں جو زندگی بنانے کے لئے درکار تھے۔ اسی لئے nuclear force ان electrons کے مقابلہ پر جو مرکز کے گرد ایک خاص طریقے سے گھومتے ہیں، بہت زیادہ ہے۔ اگر ان باہر گھومنے والے electrons کی طاقت زیادہ ہوتی تو باہر والے orbits میں رفتار بہت تیز ہو جاتی اور اندر والا مرکز nucleas جس میں protons اور neutrons ہیں وہ اچھلنے لگتے اور کوئی molecule نہ بن پاتا۔ یعنی وہ مالیکیول جو مادہ کی بنیاد ہیں جو مختلف یا ایک جیسے ایٹموں کے ملنے سے بنتے ہیں۔ پھر صرف گیس ہی گیس ہوتی۔ نہ molecule نہ پانی نہ solid اور نہ زندگی بننے کا کوئی تصور ہوتا۔

اس کے بعد gravity کا بہت بڑا role تھا اس force نے مادے کو آپس میں جوڑا اور اس جڑنے کے نتیجہ میں سب سے پہلے ستارے بنے پھر galaxies اور ان galaxies کو دیکھ کر کوئی بھی عاقل انسان کائنات بننے کے اصول اور اس میں موجود perfection کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اگر gravity کمزور ہو جاتی تو کائنات میں hydrogen گیس ہی ہوتی اور آگے chemicals بننے کا عمل نہ ہو پاتا اور ہم اس خوبصورت کائنات اور اس پیاری دنیا میں نہ ہوتے اور اگر gravity زیادہ ہو جاتی تو matter یعنی مادہ بہت جلد black holes میں مدغم ہو جاتا اور وہ material نہ ہوتا جو زندگی بنانے کے لئے بہت ضروری تھا۔ اس لئے حکیم قادر مطلق نے ان دونوں extremes کے درمیان میں gravity کی value کو رکھا اور اس طرح اس کائنات اور اس کے اجرام کو قائم رکھنے کے لئے gravity نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اگر atomic level پر دیکھیں تب بھی gravity کی مقدار perfect تھی اور اگر پورے نظام کائنات کو دیکھیں تب بھی یہ مقدار پوری طرح Controlled رہی۔

یہ جو ہمیں اتنے ستارے چمکتے نظر آ رہے ہیں وہ اس gravity ہی کے مرہون منت ہیں کہ وہ ستاروں کے مرکز کی طرف ایک ایسا کھچاؤ کو قائم رکھتی ہے (squeezing the steller core) جس کی وجہ سے وہاں وہ عمل nuclear reaction ہو رہا ہے کہ مسلسل hydrogen ایٹم سے helium بن رہا ہے تا کہ سورج اور دوسرے ستارے مصروف عمل رہیں اگر کبھی gravity نے معمولی سا بھی زیادہ squeeze کر دیا تو ستاروں بشمول سورج کے، ان کا اندر کا nuclear reaction بہت زیادہ کام کر جائے گا اور سارا material جل کر ختم ہو جائے اور تمام زندگی بھی فنا ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر ستاروں میں gravity کمزور پڑ گئی تو ستارے صرف ٹھنڈی گیس کے ہوں گے۔ چنانچہ ہم جو رات کو stable اور پُر سکون ستارے دیکھتے ہیں یہ ان ستاروں کے اندر ایک خاص level کی gravity ہے۔

(جاری ہے)

❁❁❁❁❁

اگر ہر بال ہو جائے سخن ور　　　　تو پھر بھی شکر ہے امکاں سے باہر

امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے رسالہ ”موازنہ مذاہب“ کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا:

”ایک (نیا) رسالہ جاری کیا گیا......... تھا۔ یہ ماہانہ رسالہ ہے ”موازنہ مذاہب“ جو یہاں یوکے سے چھپتا ہے اور اس میں بڑے اچھے علمی اور تحقیقی مضامین ہوتے ہیں۔ لوگوں کو بڑے پسند آ رہے ہیں، اس کی ضرورت تھی اور گو اس وقت اس کی تعداد کم ہے لیکن اس کے بارے میں میں کہنا چاہتا ہوں جو لوگ اردو پڑھنا جانتے ہیں اُن کو اس رسالہ کا خریدار بننا چاہیئے۔ اس میں کافی اچھے مضامین ہیں بلکہ بعض مضامین کے ترجمے کر کے ریویو آف ریلیجنز میں بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔“

(دوسرے دن کا خطاب، جلسہ سالانہ یوکے 2012ء بحوالہ الفضل انٹرنیشنل مؤرخہ 9 اگست 2013، صفحہ 2)